راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیراہتمام مسلسل اشاعت کا 16واں سال

ماہنامہ

ارژنگ

لاہور

Monthly
Arxang
Lahore

مدیراعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

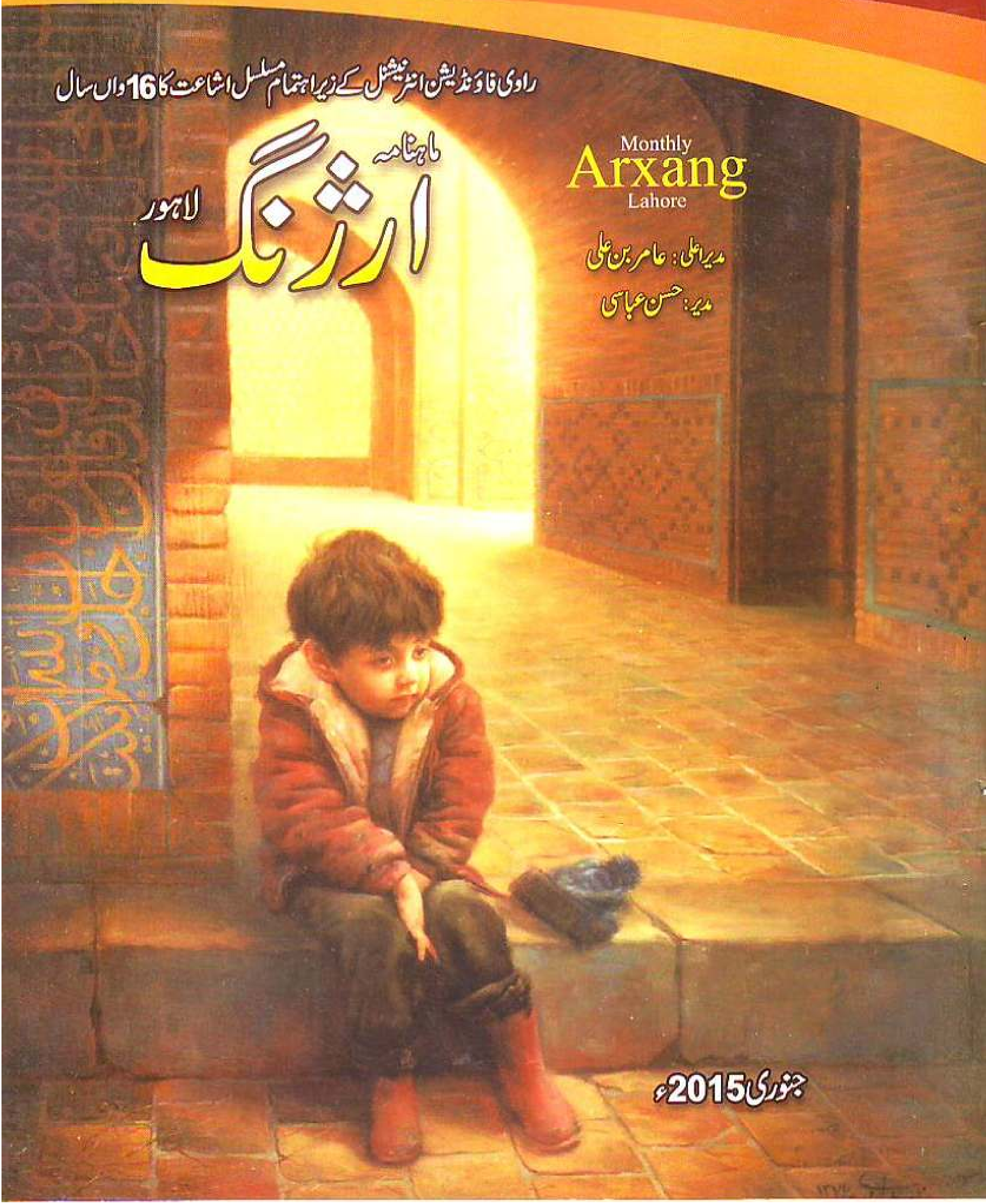

جنوری 2015ء

میں مزاح نگار نہ ہوتا تو یقیناً کوئی قاتل ہوتا۔

بچپن کی محرومیوں کا احساس انسان کو مار دیتا ہے۔

ممتاز شاعر، صحافی اور مزاح نگار **گل نوخیز اختر** سے عامر بن علی کی گفتگو

● آپ شاعری کرتے ہیں، صحافت کے شعبے سے ایک طویل عرصے سے منسلک ہیں اور پاکستان کے مقبول ترین و مصروف ترین مزاح نگاروں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ ذاتی طور پر کونسا ذریعہ اظہار زیادہ پسند ہے؟

● مجھے کالم نگاری زیادہ پسند ہے کیونکہ یہاں میں اپنی بات آسانی سے کہہ سکتا ہوں، شاعری دو لائنوں میں پورا اظہار مانگتی ہے، صحافتی بیان بالکل روکھا ہوتا ہے جبکہ میری رائے میں ہلکا پھلکا انداز آپ کی بات کو زیادہ موثر طریقے سے آگے پہنچا سکتا ہے۔

● تحریر کو ذریعہ اظہار بنانے کا خیال کب اور کیسے آیا؟

● جب پڑھنا آگیا تو لکھنے کا بھی شوق پیدا ہوگیا، بچوں کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر خود بھی امنگ اٹھی کہ میں بھی ایسا ہی کچھ لکھوں جسے دوسرے پڑھیں۔ 1986 میں امروز ''بچوں کی دنیا'' میں پہلی تحریر شائع ہوئی تو مجھے یقین ہوگیا کہ ہتھیار اٹھائے بغیر بھی اپنی بات دوسروں تک پہنچائی جاسکتی ہے۔ میں نے ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی تھی لہذا قلم کی بیساکھی نے مجھے آگے چلانے میں بڑا سہارا دیا۔

● بچپن کہاں اور کیسا گذرا؟

● پیدائش بھی ملتان میں ہوئی اور بچپن بھی ملتان ہی میں گذرا، ملتان میرے دل میں بستا ہے، یہاں میں نے بولنا، پڑھنا اور لکھنا سیکھا، اُس دور میں بچوں کے صفحات میں کہانیاں لکھنے والے رائٹرز کی اکثریت آج منجھے ہوئے لکھاریوں میں تبدیل ہوچکی ہے اور یہ سارے میرے وہی دوست ہیں جن کے ساتھ ہم کہانیوں کے مقابلے کیا کرتے تھے۔

● اہل قلم کو بنانے میں گرد و پیش کے ماحول کا کہاں تک اثر ہوتا ہے؟ آپ کا ابتدائی ادبی و صحافتی سفر کیسا رہا؟

● میرا نہیں خیال کہ ماحول کوئی اثر کرتا ہے، مثلاً میرے گھر کا ماحول پڑھا لکھا تھا لیکن اس کے باوجود لٹریچر کو شجر ممنوعہ سمجھا جاتا تھا، مجھے یاد ہے بچپن میں اس بات پر مار پڑتی تھی کہ میں ناول کیوں پڑھ رہا ہوں یا پاکٹ منی سے کہانیوں کی کوئی کتاب کیوں خریدی ہے۔ لیکن ہاں...... اگر آپ کے اندر جنون ہے تو آپ اپنا ماحول خود پیدا کرلیتے ہیں، سو میں نے بھی اپنے ہم مزاج لوگوں کو ڈھونڈ لیا جو لکھنے پڑھنے سے عشق کرتے تھے۔ ابتدائی طور پر میں نے صحافتی سفر کا آغاز ملتان کے لوکل روزنامہ ''سنگ میل'' سے کیا، اس دوران اردو اکیڈمی کے اجلاسوں میں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا، پھر ''کہکشاں'' کے نام سے اپنا میگزین نکالا جس میں پہلی بار ''ادبی اخبار'' کا آئیڈیا پیش کیا، اس کا ایک صفحہ ایسا تھا جہاں ادبی خبریں اخباری انداز میں شائع کی جاتی تھیں۔ یہی انداز آگے چل کر ''احساس نو'' اور ''مکمل'' ادبی اخبار کی شکل میں لاہور میں سامنے آیا۔

> اگر آپ کے اندر جنون ہے تو آپ اپنا ماحول خود پیدا کرلیتے ہیں۔

● اس کڑے دور میں یہ قدرتی مسکراہٹ اور زندگی سے بھرپور قہقہوں کی دولت کیسے نصیب ہوئی؟

● میں مزاح نگار نہ ہوتا تو یقیناً کوئی قاتل ہوتا۔ بچپن کی محرومیوں کا احساس انسان کو مار دیتا ہے، مجھے کہانیاں اچھی لگتی تھیں، شاعری پسند تھی اور میوزک سے عشق تھا...... لیکن ہمارے گھر میں یہ تینوں چیزیں ''غیر قانونی'' سمجھی جاتی تھیں۔ میرے اندر شروع سے ہی شرارتی پن تھا جس کا اظہار زمانہ طالبعلمی میں ہر روز ہوتا تھا، یہی شرارتی پن میری محرومیوں پر حاوی ہوتا رہا اور پھر مزاح نگار نے میرے اندر کی آگ کو رفتہ رفتہ ٹھنڈا کردیا، اب میں خود بھی خوش رہتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ میری تحریر سے دوسرے بھی خوش رہیں۔

بقیہ اندرونی صفحات

فہرست

حمد، نعت، سلام: ۵

کالم و مضامین:

- پاؤں کا چکر اور فارن آفس سے گزارش / ڈاکٹر عافر شہزاد ۸
- حمزہ شنواری / پروفیسر عاشق رحیل ۱۰
- ہمیشہ دیر کر دیتی ہوں میں / ڈاکٹر صغرا صدف ۱۲
- پابلو نرودا کے آنگن میں دو پہر / عامر بن علی ۱۴
- بچے دو ہی اچھے / ابرار ندیم ۱۶
- سید ریاض حسین زیدی کا فنی ارتقا / ارسلان احمد ارسل ۱۸
- افضال حسین سہروردی / افتخار شفیع ۱۸

افسانے، سفرنامے: صحرا اور ڈوبتا چاند / آدم شیر ۱۹

- بگلی / نسیم سکینہ صدف ۲۱
- میری محبوبہ ڈھیل / روبنسن سیموئل گل ۲۲
- بقیہ انٹرویو گل نوخیز اختر / عامر بن علی ۲۴

عالمی شاعری ۲۶ تا ۳۸

- بقیہ انٹرویو ڈاکٹر جعفر حسن مبارک / حسن عباسی ۳۹

شاعری: ۴۳ تا ۶۱

شعری گوشے: رفیع الدین راز، مظفر حسن منصور، ارشد محمود ناشاد
عشرت آفرین، شاعر علی شاعر، احسان شاہد، شمشیر حیدر، ناصر معروف
سہیلا انعام صدیقی، احمد عدنان طارق ۶۲ تا ۷۱

ادبی خبریں، تقریبات ۷۲

تبصرۂ کتب، فلیپ، آراء ۷۶

نامہ ہائے احباب ۸۴

پنجاب رنگ: انٹرویو پروفیسر جنید اکرم ۸۶

- انٹرویو ڈاکٹر نوید شہزاد ۹۲
- پنجابی شاعری ۹۵

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 16 واں سال

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر ۱۷ جنوری ۲۰۱۵ء شمارہ نمبر ۱

مدیر اعلیٰ ⊙ عامر بن علی

مدیر ⊙ حسن عباسی

مدیران اعزازی ⊙ ڈاکٹر صغرا صدف ⊙ ابرار ندیم ⊙ تن دیپ تمنا

نائب مدیران ⊙ قمر ریاض ⊙ خالد سجاد

مدیران معاون ⊙ بدر سیماب ⊙ ناصر معروف

مدیر منتظم ⊙ علی رضا مدیر پنجاب رنگ ⊙ نازاو کاڑوی

مجلس مشاورت ⊙ احسان شاہد (مطالعہ) ⊙ ظفر الاسلام (ادبیات) ⊙ سعدیہ سیٹھی (مطالعہ)

قانونی مشیر ⊙ کامران ناشط : 0300-8800339 سرکولیشن ⊙ شاہد عباسی

ارژنگ دوست ⊙ ایلا کھلر (امریکہ) ⊙ ارشد شاہین (دبئی) ⊙ اسعد رضوی (فرانس) ⊙ ارشد ندیم ساحل (چین)

کمپوزنگ ⊙ ذرداب کمپوزنگ : 0321-4730769 ڈیزائنر ⊙ نعمان حسن: 0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس ⊙ محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 ناز او کاڑوی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

(ڈاک خرچ بلا پاکستان) 1000 روپے • (ڈاک خرچ بیرون ملک 5000 روپے

رابطہ : 0300-4489310 - 0331-4489310

قیمت فی شمارہ 60 روپے

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

تو نے کچھ بھی تو دیکھنے نہ دیا
اے مری چشم تر مدینے میں

نامور کالم نویس، مزاح نگار، سفرنامہ نگار، ڈرامہ رائٹر اور شاعر

عطاء الحق قاسمی

کی کتابوں کے نئے ایڈیشن دیدہ زیب گیٹ اپ کے ساتھ شائع ہو گئے ہیں

سفرنامے: شوق آوارگی • دُنیا خوبصورت ہے • گوروں کے دیس میں • دلی دور است

طنز و مزاح: ہنسنا رونا منع ہے • عطایئے • بلبلے • وصیت نامے

شگفتہ کالم: خند مکرر • بارہ سنگھے • جرم ظریفی • دھول دھپا

آپ بھی شرمسار ہو • روزنِ دیوار سے • شرگوشیاں

مزید گنجے فرشتے (خاکے) • ملاقاتیں ادھوری ہیں (شعری مجموعہ)

ناشر: حسن عباسی

نستعلیق
Publications
غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

حُسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے

ممتاز شاعر، کالم نویس، مترجم اور ماہنامہ ''ارژنگ'' کے مدیر اعلیٰ

عامر بن علی

کی کتب کے نئے ایڈیشن مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گئے ہیں

- چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)
- سرگوشیاں (شعری مجموعہ)
- ''محبت چھو گئی دل کو'' (شعری مجموعہ)
- گفتگو (انٹرویوز)
- آج کا جاپان (کالم)
- محبت کے دو رنگ (تراجم)

ناشر: حسن عباسی

نستعلیق
Publications
غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

اُس اجنبی سے ہاتھ ملانے کے واسطے
محفل میں سب سے ہاتھ ملانا پڑا مجھے

نامور شاعر اور سفرنامہ نگار حسن عباسی کی کتب

شعری مجموعے

- جگنو میری سوچوں کے
- ہم نے بھی محبت کی ہے
- ایک محبت کافی ہے
- اک شام تمہارے جیسی ہو

سفرنامے

- محبت کے پروں میں گھنٹیاں باندھو (بھارت)
- ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا (یو-اے-ای، دوحہ)
- تتلیاں ستاتی ہیں (یورپ)

اپنی کتاب کی بہترین اشاعت کے لیے رابطہ کریں

ناشر: حسن عباسی

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

برطانیہ (نوٹنگھم) میں مقیم معروف شاعرہ، ناول نگار اور افسانہ نویس

سعدیہ سیٹھی

کی کتابیں

- کبھی ناراض مت ہونا (شعری مجموعہ)
- تنہائیاں (شعری مجموعہ)
- محبت آخری سچ ہے (ناول)
- پہیلیاں (بچوں کے لیے)

شائع ہوگئی ہیں

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

ہر طرف گہرا دھواں ہے اور میں
اک نیا پھر امتحاں ہے اور میں

چاند ہیں حد نظر تک آنکھ کے
آنسوؤں کی کہکشاں ہے اور میں

رسمِ دُنیا کے تقاضے اور ہیں
کیا کروں کہ دل جواں ہے اور میں

لاکھ اندیشے کروڑوں وسوسے
جانے کیا سے کیا گماں ہے اور میں

آنچل اوڑھے چل رہی ہوں اس کے ساتھ
سر پہ بوڑھا آسماں ہے اور میں

موت ہی لگتی ہے اُمید بہار
زندگی بھر کی خزاں ہے اور میں

سامنا ہے پھر نئی اک جنگ کا
سعدیہ پھر خانداں ہے اور میں

برطانیہ میں مقیم ممتاز شاعر

احسان شاہد

کا پہلا شعری مجموعہ اشاعت کے آخری مراحل میں

سفینوں کو کناروں سے رہا ہوتے ہوئے دیکھا
ہمیشہ ملنے والوں کو جدا ہوتے ہوئے دیکھا
محبت کی مجھے معصومیت پر اور پیار آیا
کہ جب ماؤں کو بیٹوں سے خفا ہوتے ہوئے دیکھا
جنھیں ہم نے تراشا تھا انھیں پوجا گیا آخر
بتوں کو سامنے اپنے خدا ہوتے ہوئے دیکھا
کسی کا جرم تھا لیکن سزا پائی کسی نے یاں
کسی کا قرض اوروں سے ادا ہوتے ہوئے دیکھا
تمہارا پیار پہلے صبح کے سورج کے جیسا تھا
پھر اس کے بعد تو محشر بپا ہوتے ہوئے دیکھا
یہ وہ دل ہے بچھڑ جانے کے صدمے کو سہا جس نے
یہ وہ آنکھیں ہیں جن نے دکھ بڑا ہوتے ہوئے دیکھا
وہ اک لمحہ جسے میں زندگی کا سمجھا تھا حاصل
وہی لمحہ محبت میں سزا ہوتے ہوئے دیکھا
مری آنکھوں میں جب احسان شاہد آ گئے آنسو
پھر اس کے بعد ہر منظر نیا ہوتے ہوئے دیکھا

نستعلیق
Publications
غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

عمان (مسقط) میں مقیم نوجوان شاعر

قمر ریاض

کے پہلے شعری مجموعے **جیون، تتلی اور میں** کا دوسرا ایڈیشن
اشاعت کے مراحل میں

عشق میری حیات ہو جیسے
یہی کل کائنات ہو جیسے
وہ سمجھتا ہے بھول جانا مجھے
عام سی کوئی بات ہو جیسے
ایسا لگتا ہے زندگی کا سفر
کوئی لمبی سی رات ہو جیسے
دل کے یوں ٹوٹنے سے لگتا ہے
ہو گئی میری مات ہو جیسے
میں کہاں اور وہ کہاں ہے قمرؔ
پھر بھی لگتا ہے ساتھ ہو جیسے

نستعلیق
Publications
غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

حمد باری تعالیٰ

خدایا میں گدائے مصطفیٰؐ ہوں
ترا بندہ ہوں کونے میں پڑا ہوں
ترے یہ گل، ثمر، بوٹے ہیں میرے
مرے مولا میں ان کا آئینہ ہوں
کوئی مجھ کو نہ پوچھے میرے مولا
سوالی ہوں تجھی کو پوچھتا ہوں
ہر اک آنسو ہے میرا جلوہ آرا
میں اس میں خانہ کعبہ دیکھتا ہوں
نظر بخشی خدایا تو نے ایسی
برے حالوں کو اچھا دیکھتا ہوں
ہوائیں حمد پڑھتی جا رہی ہیں
سماعت کم ہے پھر بھی سن رہا ہوں
نوازا ہے مرے مولا نے اتنا
فقیری میں بھی گھر کا بادشہ ہوں
وہی ہے فیض فرمائے حقیقی
اسی کے در پہ آنکھیں مل رہا ہوں
نظر آتا ہے عکس ماہِ طیبہ
سفر کا جب ستارہ دیکھتا ہوں
میں خود ہی کارواں ہو جاؤں ثاقبؔ
اکیلا تھا اکیلا چل پڑا ہوں

آصف ثاقبؔ/ایبٹ آباد

طوافِ حمدیہ

ہے درِ کعبہ سراپا نور کا نالہ مجھے
ظلمتیں ہٹتی گئیں، ملتا گیا مولا مجھے
ہو گئی دل سے غنیم غیر پسپا دفعتاً
ذاتِ حق کے وسوسوں کی قید سے کھولا مجھے
ہر کسی چھوٹے بڑے کو دم بخود پایا گیا
بے خودی نے کیف کی میزان پر تولا مجھے
ہر گھڑی دیکھا ہر اک ذی روح کو محوِ ثنا
ایک لطفِ دم بدم نے نور میں گھولا مجھے
جذبۂ تختم کا ہے طوافِ حمدیہ
ایک سانچے میں ریاضِ خاص نے ڈھالا مجھے

سید ریاض حسین زیدی/ساہیوال

حمد باری تعالیٰ

افلاک سے زمیں پہ ملے تیری ضو مجھے
اچھا لگے گا تب کہیں یہ ماہِ نو مجھے
اے خالقِ حیات ترے نور کے طفیل
کافی ہے ایک چراغ کی ننھی سی لو مجھے
جس دن سے میرے پاؤں میں آئی ہے یہ زمیں
تیری طرف ہی لے گئی ہر ایک رو مجھے
پروردگار تجھ سے ہی خیرات چاہیے
غربت زدہ ہوں بھیج دے تھوڑے سے جو مجھے
میں شب نژاد ورنہ اندھیروں میں دفن تھا
دل میں اُجالنے کو ملی تیری ضو مجھے

کرنل (ر) مقبول حسین/راولپنڈی

حمد باری تعالیٰ

گر رہا ہوں مجھے سہارا دے
ہر ظلمت میں ہوں کنارا دے
جو کبھی ڈوبنے نہ پائے یہاں
میری قسمت کو وہ ستارا دے
ہے اندھیرا نہ ڈگمگا جاؤں
اے خدا آسرا خدارا دے
ڈھل نہ جائے حیاتی کا سورج
دید کو طیبہ کا نظارا دے
اپنے محبوبؐ کے نواسوںؓ کا
مجھ کو اُترن دے یا اُتارا دے
زندگی ہار جاؤں تیرے لیے
یہ منافع ہے یا خسارا دے
کیا ہے بہتر مجید کیا جانے
ہے مرے واسطے جو پیارا دے

عبدالمجید چشتی/لاہور

حمد باری تعالیٰ

یقیں بھی اُس کی عطا ہے جو ہر گماں میں ہے
سبھی جہان اُسی کے جو آسمان میں ہے
فضا میں نور کسی اور قمقمے سے نہیں
یہ میرے رب کی تجلی ہے جو اذان میں ہے
بجز خدا کے کوئی تیر موڑ سکتا ہے!
یہ حکم رب ہے جو رکھا ہوا کمان میں ہے
سیاہ لگتا ہے ماتھے پہ ایک داغ مگر
بس ایک نور کی دنیا اسی نشان میں ہے
اسی سے سرخرو ہوتے رہے زمانے میں
ترے کرم کی جو اُمید امتحان میں ہے
یہ شان اور میسر کسے ہے اُس کے سوا
مرے بیان سے باہر ہے اور بیان میں ہے

اسی کے حکم سے کوئی بھنور کی زد میں رہا
اُسی کا اذنِ سفر ہے جو بادبان میں ہے

نورین طلعت عروبہ/اسلام آباد

حمد باری تعالیٰ

حمد باری بڑی سعادت ہے
ہاں مگر اپنی اپنی قسمت ہے
حرف ''کن'' تو تری علامت ہے
یاخدا! تو عظیم طاقت ہے
گردشِ ماہ و سال و صبح دم ساز
ایک ادنیٰ سا رنگِ قدرت ہے
حمد کی محفلیں بپا کیجیے
دین کی یہ بھی ایک خدمت ہے
منقبت و نعت سے ذرا ہٹ کر
حمد کی اپنی اک روایت ہے
نعت گو شاعروں کو ہے معلوم
حمد گوئی میں جتنی راحت ہے
ہم ہیں اتنے ہی بے نیاز اس سے
جتنی توحید کی ضرورت ہے
اُس کے بندوں کا ہم نوا ہو جائے
ذاتِ باری کی جس کو چاہت ہے
گاہے گاہے وہ اس کو پرکھے بھی
جس کو اللہ سے محبت ہے
مجھ سے عاصی کو دی ہے فکر اپنی
میرے مولا یہ تیری عظمت ہے
میرے ہمدم بھی کم سمجھتے ہیں
جو خدا سے مجھے عقیدت ہے
میرا اللہ سے گفتگو کرنا
اُس کی توفیق کی بدولت ہے
حمد ہوتی ہے مجھ سے برسوں میں
یہ بھی میرے لیے غنیمت ہے
حمد ہو جائے وارثی جیسی
راشد اس دل کی یہ بھی حسرت ہے

محمد ممتاز راشد/لاہور

نعت رسول مقبول ﷺ

قیامت ہے اب انتظارِ مدینہ
الٰہی! دکھا پھر دیارِ مدینہ
مری رُوح آئینہ دارِ مدینہ
مرے دیدہ و دل نثارِ مدینہ
اسی آرزو میں مٹا جا رہا ہوں
مری خاک ہو ہم کنارِ مدینہ
شفاعت مسلم، جو مل جائے مجھ کو
پے دفن، قرب و جوارِ مدینہ
ستم کا نشانہ مری زندگی ہے
کرم کی نظر شہر یارِ مدینہ
معطر ہوئی جاں، کھلا غنچۂ دل
چلی جب نسیمِ بہارِ مدینہ
یہ دُوری نہیں، حدِ پاسِ ادب ہے
اِدھر میں، اُدھر تاجدارؐ مدینہ
پیا تھا بس اک جام اُس میکدے سے
نہیں ٹوٹتا اب خمارِ مدینہ
تصور میں ہے آمد و رفت شہؐ کی
کھڑا ہوں سر رہگذارِ مدینہ
اُسے مل گئی دین و دُنیا کی دولت
ہوا دل سے جو خواستگارِ مدینہ
لگا لوں گا آنکھوں میں سرمہ سمجھ کر
اگر ہاتھ آئے غبارِ مدینہ
اُبھرنے کو ہیں سبز گنبد کے جلوے
ذرا صبر! اے بے قرارِ مدینہ
نصیر اپنی کوشش نہیں کام آتی
بلاتے ہیں خود تاجدارؐ مدینہ

انتخاب: افضال سہروردی/ساہیوال

نعت رسول مقبول ﷺ

سب جانتے ہیں حال مدینے والے
آپ دکھیوں کے ہیں لجپال مدینے والے
مجھ کو آلام و مصائب نے پریشاں کیا
میرے سب رنج والم ٹال مدینے والے
آپ کی چشم کرم کا ہے سہارا مجھ کو
میرے اچھے نہیں اعمال مدینے والے
بے سہاروں کو بچا لیتی ہے رحمت تیری
جب چلے کفر نئی چال مدینے والے
خلد کے بن گئے سردار حسنؓ اور حسینؓ
کیا حسیں آپ کے ہیں لعل مدینے والے
آپ کا رُتبہ ہے سب نبیوں سے اعلیٰ ارفع
محترم آپ ہی کی ہے آل مدینے والے

حمد، نعت، سلام

جشن میلاد کی محفل ہے سجائی جس نے
وہ صدا رہتا ہے خوش حال مدینے والے
واسطہ گنبد خضریٰ کا کرم ہو اتنا
مجھ کو بلوایئے اس سال مدینے والے
رکھ کے کاغذ پہ قلم بیٹھا ہے لکھنے ساجدؔ
لفظ نعتوں میں حسیں ڈھال مدینے والے

انتخاب: افضال سہروردی/ساہیوال

نعت رسول مقبول ﷺ

اشارا وہ اگر کر دیں تو چلتا وقت رُکتا ہے
قمر دولخت ہوتا ہے پلٹ کے شمس آتا ہے
خدا کے حکم سے ان کا سبھی پہ حکم چلتا ہے
دُرود اُن پر سلام اُن پر یہی قرآن کہتا ہے
سبب تخلیق کا وہ ہیں حقیقت آشنا وہ ہیں
کرم کی ابتدا وہ ہیں کرم کی انتہا وہ ہیں
چمن سے کوہساروں سے چھلکتی آبشاروں سے
درختوں کی قطاروں سے مہکتے ریگزاروں سے
جمال احمدؐ مرسل عیاں ہے سب نظاروں سے
وقارِ انبیاء وہ ہیں فقط خیرالوریٰ وہ ہیں
کرم کی ابتدا وہ ہیں کرم کی انتہا وہ ہیں
سلیمؔ آقا کے قدموں میں اگر میں خاک ہو جاؤں
گناہوں سے خطاؤں سے مکمل پاک ہو جاؤں
جسے کچھ بھی نہیں مخفی وہی ادراک ہو جاؤں
زمیں پر بیٹھ کر میں واقفِ افلاک ہو جاؤں
سخی سرور سدا وہ ہیں مرے مشکل کشا وہ ہیں
کرم کی ابتدا وہ ہیں کرم کی انتہا وہ ہیں

عمران سلیم/لاہور

سلام یا حسینؓ

جب تک حسینیت ہے مسلط یقین پر
اک حرف بھی نہ آئے گا دینِ مبین پر
اک بار میں نے سجدہ کیا تھا خلوص سے
خاکِ شفا ہنوز ہے میری جبین پر
چلتا ہے حکم سبطِ محمدؐ کا آج بھی
ارض و سما و روشنی و ماہ و طین پر
اب بھی مرے حسینؓ کے دشمن ہیں ہر طرف
ابھی بھی حسینؓ ثبت ہیں قلبِ حزین پر
ابر رسولِ پاک کی مانند ہیں کھڑے
اُترے ہوئے ہیں آج ملائک زمین پر
ہر سورما یزید کا حیرت میں ہے اسدؔ
عباسؓ ہیں کہ فاتحِ خیبر ہیں زین پر

اسد اعوان/سرگودھا

سلام

شوق شہادت مچل رہا ہے چہرہ چہرہ روشن ہے
صحرا میں اک بجھے چراغوں والا خیمہ روشن ہے
چاروں اور اُمڈ آئے ہیں ظلمت کے طوفان مگر
مصباح الہدایت لیکن ان میں تنہا روشن ہے
اصغرؑ کے معصوم لہو سے وادی مہکی مہکی ہے
اکبرؑ کی نوری صورت سے پورا صحرا روشن ہے
یوں تو لاکھوں سجدے ہیں تاریخ کے چہرے پر لیکن
زخمی پیشانی کا خوں آلودہ سجدہ روشن ہے
اب بھی چراغِ راہ بنا ہے نقشِ پائے مولا حسینؑ
اب بھی حق اور سچ کی منزل کا ہر رستہ روشن ہے
دل میں کاشفؔ سوگ سجا ہے جگر میں بھی اک روگ بسا ہے
اندر قبرِ حسینؓ کی لو ہے اس سے سینہ روشن ہے

ہدایت حسین کاشف/رحیم یار خاں

سلام

جو بھی غمِ حسینؓ میں آنسو بہائے گا
محشر میں وہ نبی کی شفاعت ہی پائے گا
وہ فیضیاب ہوگا وفا کے مقام سے
جو شخص ان کی راہ میں گردن کٹائے گا
یہ درس دے گئی ہے شہادت حسینؓ کی
پرچم صداقتوں کو یہاں جھلملائے گا
جو شخص بھی سلام پڑھے گا حسینؓ پر
تقدیر اپنی بگڑی ہوئی وہ بنائے گا
جو بھی غلام بن کے رہے گا حسینؓ کا
ہر غم سے اپنے آپ کو آزاد پائے گا
آسان ہوگی منزلِ مقصود اے پیامؔ
راہِ وفا میں جب بھی قدم ڈگمگائے گا

محمد اقبال پیامؔ/لاہور

پاؤں کا چکر اور فارن آفس سے ایک گزارش!

عطاء الحق قاسمی

گزشتہ چند ماہ کے دوران پاؤں کا چکر کچھ زیادہ ہی رہا۔ اندرون ملک تو کراچی میں آرٹس کونسل کی یادگار ادبی کانفرنس میں شرکت کا اتفاق ہوا اور ''سندھ ہند'' سے آئے ہوئے ادیبوں کی گراں قدر باتوں کے علاوہ احمد شاہ صاحب اور ان کی ٹیم کے اعلیٰ انتظامات سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ ایک چکر اسلام آباد کا لگا جہاں ڈاکٹر انعام الحق جاوید کے زیر انتظام نیشنل بک فاؤنڈیشن کی تازہ مطبوعات اور دیگر منصوبوں کے بارے میں متاثر کن معلومات سامنے آئیں۔ جہاں تک بیرون ملک سفر کا تعلق ہے سب سے زیادہ مصروف شب و روز میں نے کینیڈا کے دو شہروں ٹورنٹو اور ایلگری میں گزارے جو ایک دوسرے سے پانچ گھنٹے کی فلائٹ پر واقع ہیں۔ ان یادگار دنوں کی روداد مجھ پر قرض ہے۔ وہ دن نیویارک میں برادرم روحیل ڈار کے ساتھ گزرے جہاں مجھے اور سہیل وڑائچ کو پاکستانی دانشوروں، جن کی بڑی تعداد مسلم لیگ (ن) کے وابستگان کی تھی، کی ایک نشست میں اظہار خیال کا موقع ملا۔ سہیل وڑائچ تو خیر سلجھی ہوئی سنبھلی ہوئی گفتگو کے ''ماسٹر'' ہیں۔ میں نے بھی جو ''بہلیاں'' مارنا تھیں، وہ ماریں۔ ان دنوں حسن نثار بھی کینیڈا اور امریکہ میں موجود تھے۔ ایک محفل میں وہ اظہار خیال کر رہے ہوتے تو کسی دوسری محفل میں میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہوتا۔ مجھے خدشہ ہے کہ کینیڈا اور امریکہ میں مقیم پاکستانی شہریوں کو میری اور حسن نثار کی ''متضاد بیانی'' سے کہیں ''گرم سرد'' نہ ہو جائے۔ واپسی پر دو دن لندن میں برادرم احسان شاہد کی معیت میں گزارے۔ منصور آفاق نے برطانیہ کے تین شہروں میں تقریبات کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ مگر میں نے اپنے اس یار طرح دار کی ناراضگی کے خوف کے باوجود معذرت کر لی کہ تھکن سے جسم چور چور تھا۔ چنانچہ لندن میں دو دن صرف آرام کیا۔ ویسے اس آرام میں احسان شاہد کی کار میں لندن کی ''سرگشت'' بھی شامل تھی اور ظاہر ہے خوبصورت لندن کی سیر آرام ہی کے ذیل میں آتی ہے۔ باقی یہ تو بتانے کی ضرورت نہیں کہ ان تمام ''مقامات آہ و فغاں'' میں اپنے عزیز احمد میرے ساتھ ہی تھے۔

اور اب مسقط کا سفر درپیش تھا۔ جہاں سے دوبئی بھی جانا تھا۔ میری حالت تو اس دوست کی سی ہو گئی تھی جو فراغت کے لمحات میں مجھے ملنے آتا ہے تو اس کے موبائل کی کال بیل اور میسج کی ٹون وقفے وقفے کے بعد سنائی دیتی رہتی ہیں۔ جو اس کی دوسری مصروفیات کا پتہ دیتی ہیں۔ میرا معاملہ بھی ایسا ہے۔ مجھے جو حالیہ ''بیل'' سنائی دی وہ مسقط (عمان) سے سوشل کلب لٹریری ونگ کے جنرل سیکرٹری قمر ریاض کی تھی جو میرے ساتھ ایک شام اور ایک مشاعرے کے حوالے سے تھی۔ لاہور سے حسن عباسی اور امریکہ میں مقیم عشرت آفرین کو مدعو کیا گیا تھا۔ عشرت آفرین ایک اسکالرشپ پر ان دنوں لاہور آئی ہوئی ہیں۔ عشرت امریکہ جانے سے پہلے ایک بہت عمدہ شاعر کے طور جانی جاتی تھیں۔ اگرچہ ان کی یہ پہچان اب بھی باقی ہے مگر پاکستان کے ادبی حلقوں سے طویل عرصے سے رابطہ منقطع ہونے کی وجہ سے یہ پہچان قدرے محدود ہو گئی ہے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ عشرت آفرین بہرحال عشرت آفرین ہی ہے۔ لندن سے شاعر خوش نوا احسان شاہد میری آمد سے ایک دن پہلے مسقط پہنچ گئے تھے۔ سراپا محبت یہ شخص ہر اس ملک میں مجھ سے ایک دن پہلے موجود ہوتا ہے جہاں مجھے جانا ہوتا ہے اور مجھے رُخصت کر کے ایک دن بعد وہ واپس لندن چلا جاتا ہے۔ مسقط میں میری آمد تیسری مرتبہ تھی۔ پہلی دفعہ میں سید ضمیر جعفری کی معیت میں 1982 کی دہائی میں یہاں آیا تھا۔ اس وقت کے مسقط اور آج کے مسقط میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس شہر کا بڑا حصہ اس وقت ویران پڑا تھا۔ سید ضمیر جعفری مرحوم و مغفور نے ایک شعر اور ایک ''مقولہ'' اس کی نذر کیا۔ شعر یہ تھا:

اک طرف پہاڑی ہے، اک طرف سمندر ہے
اس کے بعد جو کچھ ہے بس اسی کے اندر ہے

اور ''مقولہ'' یہ تھا کہ ماضی کے بادشاہ ایک ایک دن میں علاقوں کے علاقے فتح کرتے چلے جاتے تھے۔ اب پتہ چلا کہ وہ ان ویرانوں سے صرف گھوڑے دوڑاتے ہوئے اگلے علاقوں کی طرف نکل جاتے تھے لیکن آج کا مسقط؟ بس دیکھنے کی چیز ہے۔ سلطان قابوس نے اس کی شکل ہی بدل دی ہے اور اب یہ گلف کے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا ہے۔ مجھے ایک خوشگوار حیرت یہ ہوئی کہ یہاں کے عوام خصوصاً پاکستانی سلطان قابوس (جو ان دنوں علیل ہیں) کی درازی عمر اور صحت یابی کے لیے ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں مانگتے ہیں۔ میں پاکستانیوں کی باتیں

سنتا تھا اور سوچتا تھا کہ جو بادشاہ اپنی رعایا پر اپنا خوف طاری کرنے کی بجائے ان کے دلوں میں اپنی محبت ڈالے کیا اسے بادشاہ کہلانے کا ''حق'' حاصل ہے؟

یہ تقریبات ویسے تو ایک پوری ٹیم کی شبانہ روز محنتوں کی دین تھی لیکن تین افراد ایسے تھے جو بہت زیادہ فعال نظر آئے۔ ایک تو مروت احمد، میرے خیال میں جن کی عمر مسقط شہر جتنی ہی ہے۔ کیونکہ میں ''بچپن'' سے مروت احمد اور مسقط کا ذکر اکٹھا ہی سنتا چلا آرہا ہوں۔ دوسرے ایک بہت ہی پیارے اور بے پناہ محبت کرنے والے نوجوان قمر ریاض تھے۔ وہ مجھے دیکھتے تو ان کی آنکھیں خوشی سے نم ہو جاتیں اور وہ مجھے ٹٹولتے ہوئے کہتے ''کیا میں واقعی آپ کو دیکھ رہا ہوں'' تیسرے نوجوان معروف ناصر تھے اور ان کی محبت اور والہانہ پن بھی دیدنی تھا۔ دلچسپ بلکہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ تقریب کے اخراجات کے لیے قمر ریاض نے یہاں کے اسپانسرز کو زحمت نہیں دی۔ حالانکہ وہ سب ایسے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ یہ نوجوان شاید اپنے بزرگوں کو یہ دکھا کر خوش کرنا چاہتے تھے کہ ان کے بچے اب اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے ہیں۔ تاہم ان سب کی دعائیں ان نوجوانوں کے ساتھ ہیں۔

اگر یہاں سفیر پاکستان سید ایاز حسین شاہ کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ ناانصافی ہوگی کہ ان تقریبات کی کامیابی میں ان کے ذاتی تعاون کا بہت بڑا حصہ تھا۔ بلکہ بقول قمر ریاض اگر انہیں ویزوں اور دیگر انتظامات کے حوالے سے سفارت خانے کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو رستے کی مشکلات ان کے حوصلوں کو مدھم کر سکتی تھیں۔ خود مجھے شاہ صاحب بہت اچھے لگے۔ ڈاؤن ٹو ارتھ کوئی پھوں پھاں نہیں۔ سادہ مگر انتہائی فرض شناس سفارت کار، میرے ساتھ شام اور مشاعرے کی تقریب کی صدارت کرتے ہوئے بھی وہ اپنا ''سفارتی ہاتھ'' دکھا گئے۔ انہوں نے کمیونٹی کو درپیش مسائل کے ذکر کے دوران خصوصی طور پر مجھے متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ کمیونٹی کو جو مسائل درپیش ہیں ان میں سرِدست پاسپورٹ مشین کا حصول ہے جو صرف مسقط میں دستیاب ہے، جس کی وجہ سے وہ مکین جو یمن کے بارڈر سے ملحقہ علاقوں میں رہائش پذیر ہیں انہیں تقریباً بارہ سو کلومیٹر کی مسافت طے کر کے مسقط آنا پڑتا ہے جس سے وقت اور پیسے کا ضیاع ہوتا ہے۔ دوسرا مسئلہ نادرا کے فارم کا ہے جس میں کسی شخص کا اسٹیٹس جاننے کے لیے کم از کم تین ماہ کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ اگر نادرا آن لائن فارم کی سہولت دے تو نہ صرف وقت کی بچت ہوگی بلکہ یہاں کے پاکستانی ایک طویل ذہنی اذیت سے بھی بچ جائیں گے۔ میں اس کالم کے حوالے سے اپنے فارن آفس سے گزارش کروں گا کہ وہ متذکرہ اداروں سے رابطہ کر کے پاکستانیوں کو درپیش مشکلات کا ازالہ کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔

باقی رہا یہ کہ میرے ساتھ شام میں مقررین نے میری شخصیت اور علمی و ادبی مقام اور مرتبے وغیرہ کے حوالے سے کیا کیا ''جھوٹ'' بولے تو اس کا ذکر کر کے میں اپنے آپ کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا۔ نیز یہ کہ مشاعرے میں کس نے کیا پڑھا یا ان صبح شام رات کی پرتکلف دعوتوں کا ذکر جو ادب دوستوں کی طرف سے تھیں اور وہ بے پناہ محبت جو یہاں ملی تو ان امور کے ذکر سے یہ کالم میرا ''کالم'' نہیں رہے گا۔ بس اتنا جان لیں کہ قمر ریاض کی نظامت میں راقم، عشرت آفرین، حسن عباسی اور احسان شاہد کے علاوہ مقامی شعرا میں سے مروت احمد، قمر ریاض، ناصر معروف، ذاکر حسین ذاکر، صفدر علیم اور فہیم ضیا نے اپنا کلام سنایا۔ عشرت آفرین اور حسن عباسی کی شاعری کے بارے میں کچھ کہنا اپنے قارئین کو بے خبر ثابت کرنے کے مترادف ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مقامی شاعر بھی اپنے خوبصورت کلام سے ''مقامی شاعر'' نہیں ''مہمان شاعر'' ہی لگ رہے تھے۔ لندن کے احسان شاہد نے اپنے ترنم سے مشاعرے کو نیا رنگ دیا۔ تاہم مشاعرہ لوٹنے والے ''لٹیروں'' میں حسن عباسی سرفہرست تھے۔

مسقط میں پرانے دوستوں میں سے صرف یاسین بھٹی، میاں محمد منیر اور فیاض علی شاہ سے ملاقات ہو سکی۔ فیاض علی شاہ کو عمان کی شہریت مل گئی ہے۔ میں ان کی صاحبزادی کی رسم نکاح کے موقع پر دی گئی ضیافت میں بھی شامل ہوا جو جامع مسجد کے کلچرل سنٹر میں منعقد ہوئی اور عربوں کے روایتی انداز میں قالین پر چار چار کی ٹولیوں میں ایک پرات میں ماحضر نوش فرمانے کے انداز میں تھی۔ یاسین بھٹی سے ملاقات 19 برس بعد ہوئی۔ بھٹی صاحب سیلف میڈ انسان ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ انہیں غالباً یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ مگر وہ انگریزی پورے دھڑلے سے اور برسرِعام بولتے ہیں۔ مروت احمد نے بتایا کہ بھٹی صاحب لاکھوں روپوں کے چیک ضرورت مندوں میں اس طرح تقسیم کرتے ہیں جیسے یہ چیک نہیں سادہ کاغذ ہیں اور ہاں یہاں بیوی فوزیہ قمر سے مل کر بھی بہت خوشی ہوئی۔ پروقار اپنے میاں کی دلدادہ اور میاں اس کا دلدادہ۔ اس کا ادب سے لگاؤ اپنے میاں کی وجہ سے ہے یا میاں سے اس کا لگاؤ ادب کی وجہ سے ہے یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے!

حمزہ شنواری

پروفیسر عاشق رحیل

حمزہ شنواری پشاور سے چالیس کلومیٹر دور لنڈی کوتل جسے پشتو زبان میں ''لواڑگی'' کہتے ہیں، کے ایک چھوٹے سے گاؤں ''خوگہ خیل'' کے ایک قبیلے اشرف خیل میں ستمبر ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے۔ اتفاق کی بات ہے کہ بلوچستان کے گل خان نصیر کی طرح انہوں نے بھی اپنی ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں میں ہی حاصل کی اور اس کے بعد وہ اسلامیہ کالجیٹ سکول پشاور میں داخل ہوئے۔ حمزہ کا تعلق شنواری خاندان سے تھا۔ شنواری دوسرے قبیلوں کی نسبت ایک چھوٹا سا قبیلہ تھا جسے علم و ادب اور شعر و شاعری میں کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں تھا لیکن حمزہ نے اپنے قبیلے کا نام روشن کر دیا۔ پہلے یہ قبیلہ صرف ہتھیاروں سے محبت کرتا تھا۔ اب قلم اور کتاب سے عشق کرنے لگا ہے۔ حمزہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اب اس میں عالم، ادیب اور شاعر پیدا ہو رہے ہیں۔

میر گل خان نصیر کی طرح حمزہ سنواری نے بھی اپنی شاعری کا آغاز اُردو ہی سے کیا لیکن اپنے روحانی پیشوا سید عبدالستار شاہ المعروف بادشاہ جان کے کہنے پر اپنی مادری زبان پشتو کی طرف راغب ہو گئے۔ جناب داور خان داؤد نے حمزہ صاحب کی نجی زندگی بارے نہایت دلچسپ تحقیق کی ہے۔ جس سے جناب حمزہ شنواری کی زندگی کے وہ گوشے بھی لوگوں کی نظروں کے سامنے آگئے ہیں جو ابھی تک پوشیدہ تھے۔

حمزہ بچپن میں تعلیم کی طرف زیادہ راغب نہیں تھے۔ انہیں سکول سے ڈر لگتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے ایک شعر میں خود کہتے ہیں:

دا اسرافیل رانہ شپیلی یادہ شی
زہ چہ ٹلے د مدرسہ دورم

''جب میں سکول کی گھنٹی کی آواز سنتا ہوں تو مجھے اسرافیل یاد آ جاتا ہے۔''

وہ بچپن ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ ان کو موسیقی سے بھی بہت لگاؤ تھا۔ خصوصاً رباب تو وہ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ وہ شطرنج کے ماہر کھلاڑی تھے اور بٹیر لڑانے میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ داور خان صاحب کی تحقیق کے مطابق انہیں جعل سازی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ ان ہی کے بارے ایک اور ناقد طاہر بخاری کی رائے سنئے ''حمزہ شنواری کی شخصیت ایک ایسے پھلدار سایہ دار اور بلند و بالا درخت کی مانند ہے جس کے پھل کا ذائقہ قدسی ہے۔ سایہ روحانی تسکین کی ٹھنڈک رکھتا ہے۔ جڑیں ناسوتی دنیا تک پہنچتی ہیں اور شاخیں لاہوتی فضا کو چومتی ہیں۔''

تعلیم کا سلسلہ ختم کرنے کے بعد انہوں نے درۂ خیبر کے پولیٹکل ایجنٹ کے دفتر میں کلرک کی حیثیت سے کام کیا۔ پاک افغان سرحد ہوتو رخم پر وہ پاسپورٹ افسر بھی رہے۔ بعد میں یہ کام چھوڑ کر وہ اپنے والد کے ساتھ ریلوے میں ٹھیکے لینے لگے اور پھر ریلوے میں ہی ٹکٹ چیکر کے طور پر کام کرنے لگے۔ اس طرح مختلف ملازمتوں کے بعد انہوں نے فلمی دنیا کا رُخ کیا۔ اس سلسلے میں وہ بمبئی بھی گئے۔ جب پاکستان میں پشتو فلموں کا آغاز ہوا تو انہوں نے فلم ''لیلیٰ مجنوں'' کے لیے گیت، کہانی اور مکالمے لکھ کے اپنی فلمی زندگی کا آغاز کیا۔ 1935ء میں جب پشاور میں ''آل انڈیا ریڈیو'' سٹیشن کا قیام عمل میں لایا گیا تو حمزہ شنواری ریڈیو کے لیے ڈرامے، فیچر، نظمیں اور تقریریں لکھنے لگے۔ وہ پاکستان رائٹرز گلڈ کی صوبائی شاخ کے پہلے سیکرٹری بھی مقرر ہوئے اور اُس کی شاخ لنڈی کوتل میں بھی قائم کی۔

حمزہ شنواری پشتو غزل کے ارتقاء کی کوششوں میں لگے رہے۔ اس لیے ان کو ''بابائے غزل'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ حمزہ مرحوم نے پشتو غزل کو ایک نیا لب و لہجہ، انوکھا انداز اور منفرد اسلوب عطا کیا۔ انہوں نے غزل کو جدید حالات اور معاشرے میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں سے ہمکنار کیا۔ شعری محاسن کو قائم نت نئے تجربے کیے۔ ان کا کلام روایت اور جدت کا خوبصورت سنگم ہے۔ غزلوں میں فصاحت و بلاغت بھی ہے اور خیالات کی بلندی بھی۔ اپنی غزل کے بارے میں ان کے تاثرات ملاحظہ کیجیے:

ستا پہ انگو کہ حمزہ وینو سرۂ دی
تہ شوی غزلہ زوان زہ د بابا کڑم

''تیرے رخساروں میں حمزہ کے خون کی سرخی ہے۔ اے پشتو غزل تو جوان ہو گئی ہے اور مجھے بوڑھا کر دیا۔'' یا

لاخ تخیل دا حمزہ تت نہ دے
سوک وائی پختو کہ غزل چرتہ دے

''ابھی تو حمزہ کی تخیل میں کوئی کمی نہیں آئی۔ کون کہتا ہے کہ پشتو میں غزل کہاں ہے؟''

حمزہ کی شاعری کے ابتدائی دور میں تصوف کا بہت عمل دخل رہا۔ اس کی بنیادی وجہ ان کے روحانی مرشد سید عبدالستار شاہ صاحب سے ان کی والہانہ عقیدت تھی۔ بعد میں ان کی شاعری میں قومی احساس بھی پیدا ہو گیا جس کا سرچشمہ خوشحال خان خٹک اور

علامہ اقبال تھے۔ تصوف میں ان کے پیش رو مرزا خان انصاری اور رحمٰن بابا تھے۔ جناب داور خان داؤد نے حمزہ شنواری کو خوشحال خان خٹک کے بعد پشتون قوم کا سب سے بڑا علمبردار قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا ایک شعر دیکھئے:

تہ اسلام او پختو گنڈہ دوہ خوزہ دانم
خدائے ہم کہ انسان دے نو پختون دے

"اسلام اور پشتو کو الگ الگ مت سمجھو۔ میں کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ بھی اگر انسان ہوتا تو پشتون ہوتا۔"

حمزہ شنواری کی شاعری میں طنز و مزاح کا عنصر بھی موجود ہے لیکن ان کے مزاحیہ شعروں میں بھی ایک کلاسیکل کیفیت پائی جاتی ہے۔ مزاح کی ایک مثال ملاحظہ کریں:

حمزہ گراگ دے زاہد تہ ہم مے سکل
لسیدل پہ ثوابو نو عزابونہ

"میں زاہد کی باتیں بھی سن رہا تھا اور شراب بھی پی رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے ثواب عذاب کو غسل دے رہا ہو۔"

حمزہ شنواری صاحب نے علامہ اقبال کے شعروں کو بھی پشتو میں منتقل کیا اس سے اگر ایک طرف انہوں نے ترجمہ نگاری کے فن پر اپنی دسترس کو ثابت کیا تو دوسری طرف اقبال شناسی کا بھی ثبوت پیش کیا۔ حمزہ شنواری کے اپنے شعر اور مضامین بھی روسی زبان میں بھی ترجمہ ہوئے۔ ڈاکٹر قابل خان آفریدی نے 1991ء میں انگریزی زبان میں حمزہ کے فن اور شخصیت پر ایک بصیرت افروز تحقیقی مقالہ لکھ کر پشاور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ حمزہ شنواری صاحب کی خوش قسمتی ہے کہ قدر دانوں نے انہیں ان کی زندگی میں ہی خراج عقیدت پیش کیا۔ اس بات کے وہ خود بھی معترف تھے ورنہ ہم تو اپنے مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور زندوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں لیکن پشتو شعر و ادب میں اب تک جتنا کچھ حمزہ کے بارے میں مختلف رسالوں اور کتابوں میں لکھا گیا ہے وہ کسی اور شاعر یا ادیب کو نصیب نہیں ہوا۔

حمزہ شنواری ایک پروقار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ نہایت مہمان نواز، خلیق، ہمدرد، غریب پرور، ملنسار، مردم شناس اور انس و محبت کے پیکر تھے جنہیں قدرت نے بہت سی بصیرتوں سے نوازا تھا۔ وہ ایک سچے اور سچے انسان تھے۔ ان کی زندگی مشرقی روایت کا ایک بھرپور نمونہ تھی۔ وہ اپنی روزمرہ زندگی میں سادگی اور عجز و انکساری کا نمونہ رہے۔ ہر چیز میں سادگی کو مدنظر رکھا اور ہر ایک کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنا ان کا دستور العمل تھا۔ حمزہ نے ہمیشہ مسکین کو امارت پر ترجیح دی۔ وہ کہتے ہیں:

امارات را تہ اخکارا شو بے نمکہ
پہ نمک د مسکینی پہ دغلہ خوند شو

"مجھے امارت بے لذت نظر آئی۔ مسکینی کے نمک نے منہ میں بہت اچھا ذائقہ پیدا کیا۔"

پشتو غزل کی طرح حمزہ کی اُردو غزل میں بھی روایت اور جدت کا تناسب اور متوازن امتزاج ملتا ہے۔ ان کی اردو غزل کا کوئی مجموعہ ابھی تک نہیں چھپا لیکن اُن کے معیار کا اندازہ ان چند غزلوں سے لگایا جا سکتا ہے جو مختلف جرائد میں چھپیں۔ جو ان کی پشتو غزلوں کے معیار کی ہیں۔ انہوں نے نظم و نثر دونوں صنفوں میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے۔ انہوں نے غزل، قطعہ، رباعی، نظم، افسانہ، ڈرامہ، ناول، سفرنامہ، گیت، مکالمے، سوانح عمری، تصوف اور فلسفے پر بھی طبع آزمائی کی۔ ان کی چھپی ہوئی کتابوں کے نام یہ ہیں۔ پشتو کی بجائے اُردو میں ہی لکھ رہا ہوں۔ صدائے دل (نعتیہ مجموعہ) انگڑائی (نظمیں غزلیں، قطعے اور رباعیاں 1991 تک اس کے دس ایڈیشن چھپ چکے ہیں) حرکت یا کوچ (یہ بھی غزلوں کا مجموعہ ہے) زندگی اور حرکت (اس میں انسانی زندگی کے مختلف پہلو بیان کیے گئے ہیں) ندی (1960 سے 1965 تک کی غزلیات کا انتخاب ہے)

ڈیہ اکبر (اس میں 203 غزلیں ہیں) آئینے میں بہار (غزلیں) ہچکیاں (رباعیات اور قطعات کا مجموعہ) تجلیات محمدیہ (تصوف کے بارے میں نثری تصنیف) نوی موجیں (ناول) جدید پشتون (افغانستان کا سفرنامہ)، زندگی (زندگی کے تجربات و مشاہدات) انسان اور زندگی (زندگی کتاب کا اُردو ترجمہ) خوشحال خان خٹک کا ایک شعر (تصوف) گہرے تفکرات (مضامین کا مجموعہ) تسخیر کائنات (پیر عبدالستار شاہ صاحب کی سوانح عمری) خشکی کے راستے حج بیت اللہ کا سفرنامہ۔ انسان اور خدا (حمزہ اور کوئٹہ کے معروف ادیب جعفر اچکزئی کے آپس میں لکھے گئے خطوں کا مجموعہ) انا اور علم (اُردو زبان میں فلسفیانہ مباحث) وجود و شہود (اُردو زبان میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا مفصل ذکر) حمزہ شنواری کے سو خطوط کا مجموعہ (طاہر آفریدی نے 1994 میں مرتب کیا) ان کے علاوہ ان کے ان چھپے مسودوں کی تعداد بارہ ہے۔

حمزہ شنواری کی ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں صدارتی ایوارڈ "برائے حسن کارکردگی" اور "ستارہ امتیاز" سے نوازا گیا۔ ان کی کئی کتابوں پر دیگر انعامات بھی ملے۔ اُن کی مشہور کتاب "سلگی" پر خوشحال خان خٹک ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔

فخر علم و ادب کا یہ روشن چراغ ستاسی سال کی عمر میں 8 فروری 1994 بروز جمعہ 5 بجے رات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔ اُن کو ان کے آبائی گاؤں لواڑگی میں ہی دفن کیا گیا۔ رہے نام اللہ کا۔

ہمیشہ دیر کر دیتی ہوں میں

ڈاکٹر صغرا صدف

منیر نیازی کا یہ مصرع شاید خطا کے پتلے ہر انسان کی فطرت کا خاصا ہے۔ مگر کبھی کبھی یہ ایک ایسے پچھتاوے کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو ہر لحہ دل کے احساس کو مجروح کرتا ہوا درد کی شدت کو یوں بڑھاتا ہے کہ سانس بھی آرے کی طرح محسوس ہونے لگتی ہے۔ احمد عقیل روبی کی اس جہانِ فانی سے اچانک روانگی کی خبر سنتے ہی اوسان پر بجلی بن کر گری اور لبوں پر یہ مصرع بین میں ڈھل گیا۔ احمد عقیل روبی سے میرا رشتہ بہت مضبوط اور سچا ہے۔ کیوں کہ عقل، علم، سوچ اور محبت کے جذبوں سے پروئے ہوئے رشتے ہی اصل اور خالص کہلاتے ہیں۔ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد ایک دن اچانک احمد عقیل روبی سے ملاقات ہو گئی۔ میں، عامر بن علی اور ابرار ندیم اکٹھے ان کی بیعت سے سرفراز ہوئے۔ اس دن سے وہ زندگی کی ہر غمی، خوشی میں شاباش اور دلاسے کی طرح موجود رہے۔ ایک دن کسی سوال پر انہوں نے کہا کہ ''تم لوگ میرے بچے ہو اور تمہارے جیسے بچوں کے ہوتے ہوئے مجھے بچوں کی کمی کیوں محسوس ہو گی؟'' لیکن بیاض میں ان کی کہانی طوطا پڑھ کر میری روح کانپ اٹھی اور ہر دردمند دل دکھی ہو گیا۔ کیوں کہ انہوں نے طوطے کو اپنا بیٹا لکھا تھا اور اس ڈاکٹر کے ساتھ جرح کی جو اسے ان کا بیٹا ماننے کو تیار نہ تھا۔ ان کی ذات کا سارا کرب اور تنہائی کی اذیت اس افسانے میں در آئی۔ شاید کبھی کبھی محرومی انسان کو بے بس کر دیتی ہے یا دل کے درد کا پیمانہ چھلک جاتا ہے۔

وہ احمد عقیل روبی اس دنیا سے رُخصت ہوا جو پاکستان کا علمی اور ادبی حوالہ تھا۔ جو آدم سے انسان کا سفر طے کر کے اگلی منزلوں کی طرف رواں تھا۔ جس کی دائیں جیب میں مادی اور بائیں میں روحانی دنیا کے خزانے کی کنجیاں موجود رہتی تھیں۔ جو دل اور کائنات کو دشتِ طلب سمجھ کر کھوج کے سفر پر گامزن رہنے کو عبادت سمجھتا تھا۔ جو علم کے گہرے سمندر میں پنہاں گوہر نایاب تک رسائی حاصل کر کے اس کی روشنی اپنی ذات میں جذب کر کے نئی جہتیں متعارف کروانے کا سفر آغاز کر چکا تھا۔ جس کا ہر لحہ عقل و وجدان کی رہنمائی میں تحقیق کے نئے اُفق تلاشنے پر مامور تھا۔ جس کا تخیل ان دیکھی سرزمینوں کی سیر کا اسیر تھا۔ جسے شعور اور لاشعور کی رمز کا پاس ورڈ معلوم ہو چکا تھا۔ جو زندگی کے ظاہری و باطنی حسن اور حیات و کائنات کے اسرار کی جستجو میں محو رہتا تھا۔ جس کی حد ادراک صرف ظاہری آنکھوں تک محدود نہ تھی بلکہ تشکیک کو یقین کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے تجریدی خیالات اور تصورات کو تجسیم کر کے پیش کرنے کی قدرت رکھتا تھا۔ جو صفحات کے احاطے میں لامحدود وسعتوں کو سمیٹ کر قرینے سے سجانے کا ہنر جانتا تھا۔ جس کی ذاتی آرٹ گیلری میں حسین لفظوں کی نمائش ذہنوں کو تر و تازگی کے ساتھ سوچ کے نئے زاویے فراہم کرتی تھی۔ علم، تحقیق اور تخلیق جس کی ہستی کے اجزائے ترکیبی تھے، جسے موجودہ اور رائج علوم کی کوکھ سے نئے معنی اخذ کرنے کا گر معلوم تھا، جس کے دل کی تختی مختلف زبانوں، تہذیبوں اور سماج کے علوم سے مزین تھی مگر وہ خود کو طالب علم کہلوانا پسند کرتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ مشاہدے، تجربے، تجزیے، خیال، خواب، الہام اور وجدان کے واقعات کو منفرد انداز میں رقم کر کے ادب کے اعلیٰ شہ پارے تخلیق کرنے اور قاری کی جمالیاتی حس کو دادِ تحسین پر آمادہ کرنے کا سلیقہ جانتا تھا۔ دنیا کے ہر موضوع کے حوالے سے اس کے دماغ کے کمپیوٹر میں مصدقہ معلومات موجود تھیں۔

وہ سب کا دوست تھا مگر نئی نسل کے لوگوں سے خاص رابطہ رکھنا اور غیر محسوس طریقے سے انہیں سوچ پر راغب کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اس نے لوگوں کی اخلاقی اور جمالی تربیت کے لیے فلم کی کہانی اور گیت لکھے۔ ٹی وی کے لیے لوک داستانوں پر مبنی ڈرامے لکھ کر نئی نسل کو اپنی تہذیب و کلچر سے آشنا کیا۔ وہ ادیب، شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، خاکہ نگار، کہانی نویس، گیت نگار، محقق اور دانشور بڑا تھا یا انسان فیصلہ مشکل ہے۔ اپنے

نام کے ساتھ روبی کا تخلص عجیب معنویت کا حامل تھا۔ حالانکہ وہ جوہری تھا اور ہر لمحہ روبی کی چمک دمک سے دنیا کو منور کرنا اس کا وظیفہ تھا۔ وہ تمام عمر یونان کی سرزمین سے طلوع ہونے والے علم، ادب اور تحقیق کے سورج سے پیوستہ رہا اور اس کو ذریعہ بنا کر اپنی دھرتی کے لوگوں کو دعوتِ فکر دیتا رہا۔ پتہ نہیں وہ کتنا کامیاب ہوا۔ خبر نہیں اس کے لفظوں اور دانش کی دستک سے کتنے دل بیدار ہوئے۔ اسے محبت کرنا، نبھانا، روٹھنا، منانا، بحث کرنا تو آتا تھا مگر گلہ کرنے سے ناآشنا تھا۔ زمانے کی ناقدری پر دل گرفتہ ہونے کو تیار نہ تھا۔ اپنے ذاتی پیسوں سے ضخیم کتابیں چھاپ کر لوگوں کو تحفتاً بھیج کر مطالعے کی درخواست کرنے والا فون کر کے پوچھنا کبھی نہیں بھولتا تھا کہ قاری نے اس کے لفظوں کے عقب میں پناہ گزیں حقیقت تک رسائی حاصل کی یا نہیں۔ ایک انسان جس کے اندر خیر ہی خیر تھی کو کینسر نے بے بس کر دیا۔ مگر اس نے ہار تسلیم نہ کی اور علاج کے کٹھن مرحلوں کے دوران بھی اس کا حوصلہ اور کام کرنے کا انداز متاثر نہ ہو سکا۔ احمد عقیل روبی جیسے لوگ معاشرے کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ دنیا ایسے ہیرے جیسے لوگوں کو علمی، ادبی اور ثقافتی اداروں کی سربراہی عطا کر کے ان کی خدمات سے معاشرے کی اخلاقی اور جمالیاتی تربیت کرتی ہے۔ مگر ہمارے یہاں انہیں نظر انداز کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ فضیلت کا معیار معاشی حیثیت اور سیاسی مرتبہ سمجھا جاتا ہے۔ بھلا ہو عطا الحق قاسمی کا جنہوں نے اپنی ذاتی کاوشوں سے احمد عقیل روبی کو پرائیڈ آف پرفارمنس دلوا کر اس اعزاز کا اعزاز قائم رکھا۔

فلسفے سے محبت نے مجھے احمد عقیل روبی کے اور قریب کر دیا۔ ایک دن وہ ''یونان کا ادبی ورثہ'' کا مسودہ لیکر آئے اور اسے چھپوانے کا حکم صادر کیا۔ مگر علم و حکمت پر مبنی کتب کو چھاپنے کی روایت ہمارے ہاں کم کم ہے۔ اس لیے ان کے حکم کی تعمیل کو میں نے اپنا فخر سمجھا اور اس کے بعد ان کی ایک اور کتاب ''جنادر کتھا'' کو چھاپنے کا اعزاز بھی مجھے حاصل ہوا۔ یہ کتابیں پڑھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کائنات کی ہر شے سے مخاطب ہونے کا گُر جانتے تھے۔ میری درخواست پر انہوں نے پنجابی صوفی شاعروں کا مغربی مفکرین کے ساتھ تقابلی جائزہ لکھنا شروع کیا۔ ''ترنجن'' میں اُن کے کئی مضامین شائع ہوئے۔ آج کل وہ اپنے خاکوں کی کتاب ادارے کے حوالے کرنے والے تھے لیکن اس سے پہلے وہ پنجابی میں ترجمہ ڈرامہ ''میرا متوالی'' چھپوانا چاہتے تھے۔ مجھے اپنے عہد کے لوگوں کی پسند اور حوصلے کا خوب اندازہ ہے۔ اس لیے یہ کتاب انہیں بتائے بغیر ذاتی طور پر چھپوانا چاہتی تھی۔ وہ اس بارے میں بڑے پرجوش تھے۔ اکثر فون کر کے پراگریس پوچھتے رہتے تھے۔ یہ چھوٹی سی کتاب میری ذرا سی غفلت سے تاخیر کا شکار ہو گئی ورنہ دو ہفتے قبل چھپ چکی ہوتی۔

وہ گھنٹوں میرے دفتر میں بیٹھے رہتے تھے۔ مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہتیں۔ زندگی سے بھرپور انسان پر بیماری اور عمر نے کوئی تھکاوٹ طاری نہیں کی تھی۔ وہ ایک مثال تھے۔ ایک حوصلہ اور ایک مقصد۔ میں ''میرا متوالی'' کو ذاتی طور پر اسی خوبصورتی کے ساتھ شائع کروں گی جس کی انہیں خواہش تھی۔ مگر اس کتاب کو دیکھنے پر ان آنکھوں کی چمک کبھی دیکھ نہ پاؤں گی۔ میں کیا کروں اپنی دیر، اپنی کوتاہی، اپنی کم عقلی، اپنی بے توجہی اور بے بسی کا کتنا ماتم کروں؟ وقت تو واپس نہیں آتا۔ شب و روز کی فضول بھاگ دوڑ میں میں نے اپنے کتنے رشتوں ناتوں کو نبھانے میں دیر کر دی ہے۔ پتہ نہیں کب تک اس کا خمیازہ بھگتنا میرا مقدر رہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں بھی تو اسی معاشرے کا فرد ہوں جو علم دشمن معاشرہ کہلاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ میں اتنی بے حس کیوں نہیں ہوں؟ میرے پاس میری غلطیوں کی توجیہات کیوں نہیں ہیں؟ میری کوتاہیاں میرے ضمیر پر پچھتاوے کی دستک کیوں دیتی رہتی ہیں؟

بجھتے ہوئے دیے کو بچانے لگی ہوں میں
خود کو ہوا کے سامنے لانے لگی ہوں میں
یہ جرأت نگاہ کسی اور میں نہیں
سورج کو دیکھ آنکھ دکھانے لگی ہوں میں
اے گرد خواہشات میری ہم سفر نہ ہو
دامن یہاں سے جھاڑ کے جانے لگی ہوں میں
لہروں پہ ڈال کر یہ سلگتی ہوئی نظر
پانی میں کیسی آگ لگانے لگی ہوں میں
تعمیر کر رہی ہوں محلات آرزو
اُجڑے ہوئے دیار سجانے لگی ہوں میں
تجھ کو سحر کے نام پر ظلمت عزیز ہے
یہ سوچ کر چراغ جلانے لگی ہوں میں

رخسانہ سحر/اسلام آباد

پابلو نرودا کے آنگن میں ایک دوپہر

عامر بن علی/جاپان

اس وقت میں پابلو نرودا کے گھر کے صحن میں بیٹھا ہوں۔ یہ مکان نوبل انعام یافتہ انقلابی شاعر اور سیاستدان نے اپنی محبوبہ کے لیے تعمیر کروایا تھا۔اس رہائش گاہ کا نام بھی نرودا نے اسی حسینہ کی گھنی زلفوں کی نسبت سے ''لا چکونا'' رکھا تھا۔ گھنگھریالے بالوں والی یہ خاتون خوشنوا شاعر کی تین بیویوں کے علاوہ تھی۔ میرے قریب بینچ پر برازیل کا ایک نوجوان شاعر بیٹھا بتا رہا تھا کہ اس کی ذاتی شاعری فرانسیسی اور ہسپانوی زبان کے علاوہ پرتگیزی زبان میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ پابلو نرودا کے آستانے کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ اس گھر کی فضا محبت سے معطر ہے۔ گھر کی ایک ایک اینٹ سے محبت چھلکتی ہے۔ ناہموار پتھریلی پہاڑی کے دامن میں واقع اس مکان کی تعمیر اس انداز سے کی گئی ہے کہ وہاں پر پہلے سے موجود کوئی ایک درخت بھی نہیں کاٹا گیا اور پہاڑی کے فطرتی پیچ وخم کو بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کم وبیش چار کنال کے رقبے پر پھیلے اس مکان کو بناتے ہوئے جس تعمیری مہارت کا مظاہرہ کیا گیا ہے وہ فقید المثال ہے۔ یہ گھر قطعی طور پر مہنگا نہیں لگتا، بالکل سادہ مگر آرٹ کا ایک شاہکار معلوم ہوتا ہے۔

اس مکان کی سیر سے پابلو نرودا کی ہمہ جہت شخصیت کا ایک اور پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اسے فن تعمیر سے بے حد لگاؤ تھا۔ فن تعمیر سے اس کی دلچسپی کا مظہر وہ تین مکان تو ہیں ہی جو اس نے خود ڈیزائن کیے اور اپنی نگرانی میں تین مختلف شہروں میں تعمیر کروائے۔ ایک اور مکان کا ماڈل اس گھر کی لائبریری، جس کے آنگن میں اس وقت میں براجمان ہوں، پڑا ہوا ہے۔ نرودا اس مکان کی تعمیر کروانا چاہتا تھا مگر وقت نے وفا نہیں کی اور شاعر کا یہ خواب حقیقت کا روپ نہ دھار سکا۔ کیسے کیسے دلچسپ پہلو ہیں اس انوکھے گھر کے، جن میں سے ایک یہ پہلو بھی کہ ہر موڈ کے لیے شاعر نے الگ کمرہ بنا رکھا تھا۔ اگر کسی صبح ناسٹلجیا محسوس ہوا تو پھر وہ دن ناسٹلجیا کے لیے مخصوص کمرے میں گزرتا۔ خوشی اور غمگین موڈ کے لیے کمرے الگ الگ رکھے تھے۔ عین ممکن ہے کہ بعض قارئین کنفیوژن کا شکار ہو جائیں کہ میں نہ جانے دنیا کے کس کونے کا تذکرہ کر رہا ہوں۔ عرض ہے کہ میں اس وقت لاطینی امریکہ کے ملک چلی کے دارالسلطنت سنتا گو سے آپ سے مخاطب ہوں۔

چلی کی وجہ تسمیہ کے حوالے سے سرد موسم اور سالم سبز مرچ سے مشتق ہونے سمیت کئی روایات موجود ہیں۔ اس بارے میں سب سے دلچسپ اور قرین قیاس روایت قدیم مقامی قبائل اور انہی کے نام سے منسوب زبان ماپوچے سے ماخذ ہے۔ ماپوچے زبان میں چلی کا مطلب خشکی کا آخری کنارہ ہے۔ اسے زمین کا خاتمہ کے طور پر بھی ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ تاریخی ماپوچے روایت اس لیے بھی دل کو لگتی ہے کہ زیادہ منطقی اور دھرتی سے جڑی ہوئی ہے۔ اگر دنیا کا نقشہ الٹا کر کے دیکھیں تو چلی کی پٹی کے آگے بحرالکاہل اپنی انتہاہ گہرائیوں اور بے پناہ وسعتوں سے لبریز نظر آتا ہے۔ یہ ملک کئی لحاظ سے منفرد ہے۔ لاطینی امریکہ کا یہ واحد ملک ہے جس کے باشندوں کی غالب اکثریت نسلی اعتبار سے یورپی نژاد ہے۔ خوبصورتی اس معاشرے کی مگر یہ ہے کہ نسل پرستانہ رویہ یہاں معدوم ہے۔ اس سے اندازہ لگا لیجیے کہ برسوں یہاں سکونت پذیر رہے اور مسلسل رابطے کے باوجود مجھ پر گزشتہ سال یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ ملک کی اکثریتی آبادی یورپی النسل ہے۔ وہ بھی یوں کہ میں یہاں کے ایک کرنسی نوٹ پر چھپی ایک فوجی افسر کی تصویر دیکھ کر اس کی تاریخ ڈھونڈنے نکلا تھا۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ سپاہی دارالحکومت سنتیاگو کا بانی اور معمار پیدرو دی بلدیویا ہے۔ موصوف ہسپانوی نژاد ہیں۔ مجھے تھوڑا تعجب ہوا کیونکہ مقامی لوگ تو کبھی بھی غیر ملکی نوآبادیاتی حکمرانوں کو اپنا ہیرو تسلیم نہیں کرتے۔ دنیا کا چاہے کوئی بھی ملک ہو اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی منکشف ہوگئی ہے کہ ملک کی غالب اکثریت ہسپانوی، جرمن، فرانسیسی و دیگر یورپی

ممالک سے ہجرت کر کے آنے والے لوگوں پر مشتمل ہے۔

یوں تو پابلونرودا کے سنتیاگو میں واقع جس گھر کے صحن میں بیٹھا ہوں وہ مرجع خلائق ہے مگر از لانیگرا والے مکان کی اہمیت زیادہ ہے۔ اول وجہ تو یہ ہے کہ نرودا اور اس کی بیوی متلدے اس گھر کے آنگن میں مدفون ہیں۔ دوم نرودا کی دنیا بھر کی سیاحت اور کئی ملکوں میں سفارت کاری کے دوران اکٹھی ہونے والی سوغاتیں، نشانیاں، عجائبات اور فن پارے اسی فیصد اس گھر میں موجود ہیں۔ عجیب وغریب اکٹھی کرنے کا پابلونرودا کو بہت شوق تھا۔ بلکہ جنون کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ گھر کا فرنیچر ایسا ہے کہ کوئی چیز دوسری سے نہیں ملتی۔ ماسوائے ڈائننگ ٹیبل کی کرسیوں کے۔ وہ بھی آپس میں تو ضرور ملتی ہیں مگر دنیا میں ایسی عجیب کرسیاں کم از کم میں نے تو اور کہیں نہیں دیکھی ہیں۔ تینوں گھروں میں دو دو مے خانے ہیں جن میں رنگین گلاس اور جام رکھے ہیں۔ پیلے، سبز، نیلے، سرخ۔ شاعر کا عقیدہ تھا کہ جام کا رنگ بدلنے سے مشروب کا ذائقہ بدل جاتا ہے۔

نرودا کے گھروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اسے سمندر سے خصوصی لگاؤ تھا۔ پابلونرودا فاؤنڈیشن جو اس کے نام سے منسوب ہے اس کے تینوں گھروں کا انتظام چلاتی ہے جو کہ اب میوزیم بنا دیے گئے ہیں۔ اس کی کتابوں کی اشاعت کے اہتمام کے علاوہ دیگر تقاریب ومنصوبہ جات کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ اس فاؤنڈیشن کا مونوگرام مچھلی ہے۔ از لانیگرا والا گھر ساحل سمندر پر واقع ہے۔ گھر کے اُوپر ایک کشتی بنی ہوئی ہے جہاں سے کھلا سمندر نظر آتا ہے۔ اپنے قیام کے دوران بلا ناغہ اس کشتی میں بیٹھ کر نرودا کئی کئی گھنٹے سا گر تکتا رہتا، شراب پیتا اور شعر گوئی کرتا۔ عہد ساز شاعر اور کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے صدر کے منتخب اُمیدوار، عاشق مزاج فنکار کا کہنا تھا کہ ایک خاص وقت کے بعد اس کشتی میں بیٹھے ہوئے وہ خود کو سمندری سطح پر سفر کرتا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے۔ لاچسکونا میں بھی ایک بحری جہاز کا ماڈل گھر کا اہم حصہ ہے۔ گائیڈ کے بقول نرودا اکثر اس بحری جہاز میں بنے کپتان کے کیبن میں سو جاتا تھا۔ سیاسی جلاوطنی کے دوران اٹلی کے جزیرے کیپری پر نرودا کا قیام رہا۔ وہاں پر بھی سمندر کے ساحل پر ہی رہائش اختیار کیے رکھی۔ اس قیام پر اطالوی زبان میں ایک ایوارڈ یافتہ فیچر فلم بھی بنی ہے جس کا نام "IL Postino" ہے۔ جلاوطنی کے دوران جو ڈاکیا اس کو ڈاک لا کر دیتا تھا نرودا کی اس کے ساتھ دوستی ہوگئی تھی۔ چلی واپسی کے بعد نرودا نے اس ڈاکیے سے فرمائش کی تھی کہ وہ کیپری کرے ساحل پر سمندر کی لہروں کی آواز ریکارڈ کر کے اسے بھیجے۔ جس کی مذکورہ ڈاکیے نے تعمیل بھی کی تھی۔ جس شخص کو ادب کے نوبل انعام یافتہ لوگ بیسویں صدی کا کسی بھی زبان میں سب سے بڑا شاعر مانیں اور جس کی نظم ''ماچوپیچو کی بلندیاں'' کو میساچیوسٹس یونیورسٹی امریکہ میں شعبہ تخلیقی آرٹ کے سربراہ ''انسانی تاریخ میں سب سے بڑی سیاسی نظم'' قرار دیں وہ شاعر عام زندگی میں بھی عام لوگوں سے اتنا سا تو مختلف ہوگا ہی۔

پابلونرودا کے گھر جاتے ہوئے ایک گلی کا موڑ مڑا تو سڑک کا نام کنداں تھا۔ 21 مئی لاطینی امریکہ کے ممالک میں اہم تواریخ کے نام پر سڑکوں اور گلی محلوں کے نام رکھے جانے کا رواج بہت مقبول ہے۔ 5 اگست، 11 ستمبر، 16 نومبر، 25 دسمبر، یکم جنوری۔ یہ سب یقیناً تاریخیں ہیں مگر چلی کے ہر دوسرے شہر میں یہ سڑکوں کے نام بھی ہیں۔ پچھلی مرتبہ اس گھر کی سیر ہمیں گائیڈ لڑکی انجلا نے کروائی تھی مگر اس بار استقبالیے پر ہمیں برقی ہیڈ فون تھما دیے گئے۔ جن سے آپ اپنی پسندیدہ زبان میں، اس گھر کی تاریخ اور نرودا کی زندگی سے اس نسبت کے بارے میں تمام اہم معلومات وتفاصیل سن سکتے ہیں۔ کتنا اچھا ہوگا اگر ہماری حکومت اہم قومی ہیروز کے مکانات خرید کر ان کو اسی طرز پر عجائب گھروں میں تبدیل کر دے۔ اس سلسلے میں فیض گھر ایک قابل تقلید مثال ہے۔ فیض احمد فیض کے اہل خانہ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے انقلاب ورومان کے عظیم شاعر کے ماڈل ٹاؤن لاہور میں واقع قیمتی مکان کو رضاکارانہ طور پر ایک عوامی مقام میں تبدیل کر دیا ہے۔

اکیلا کون مری جان ایسے آتا ہے
کوئی پرندہ، پرندے کو گھیر لاتا ہے
یہی چراغ جلائے گی ایک دن میرے
یہ جس ہوا سے مجھے آج تو ڈراتا ہے
افتخار اشعر

بچے دو ہی اچھے

ابرار ندیم

پٹھان: ہم 35 بہن بھائی ہیں
لڑکی: کیا تمہارے گھر فیملی پلاننگ والے نہیں آئے تھے؟
پٹھان: آئے تھے ہم سب سپارہ پڑھ رہے تھے وہ مدرسہ سمجھ کر واپس چلے گئے

قطع نظر اس کے کہ یہ ایک لطیفہ ہے یا کوئی سچا واقعہ پٹھان بھائیوں سے انتہائی معذرت کہ ہم نے اسے بغیر کسی کانٹ چھانٹ یا "ایڈیٹنگ" کے من وعن لکھ دیا ہے۔ گو اس سے پہلے ہم نے "صحافتی بد دیانتی" کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے طور پر مذکورہ بالا لطیفے یا واقعہ میں سے لفظ "پٹھان" کو "سردار" کے ساتھ تبدیل کرنے کی بھی ایک حقیر سی کوشش ضرور کی لیکن بات بنی نہیں۔ 35 بچوں اور مدرسہ کے ساتھ جو "انٹیل کمبینیشن" ہمارے پٹھان بھائیوں کا بنتا ہے اُس کے سامنے اپنی تمام تر دلیری اور زندہ دلی کے کوئی "سردار" جچتا دکھائی نہیں دیتا۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا! آپ یہ تجربہ خود کر کے دیکھ لیں آپ کو اس لطیفے پر ہنسی تو کیا آنی ہے یقین کرنا ہی مشکل ہو جائے گا کہ فی زمانہ ناخالص آب و ہواؤں اور ناخالص خوراک سے پلا کوئی ایسا "جی دار" بھی ہو سکتا ہے جس کے دس نہ بارہ پورے تیس اور پانچ پینتیس بچے ہوں۔ اپنے پٹھان بھائیوں کا معاملہ البتہ اس لئے مختلف ہے کہ ماشاء اللہ سے انہوں نے ہر شعبہ زندگی میں دُنیا بھر سے اپنے "فن" کا لوہا منوایا ہے اور بارہا ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے۔ اس حوالے سے لالہ شاہد آفریدی کی مثال بھی دی جا سکتی ہے جو اگر پٹھانوں کی روایتی شرافت، وضع داری اور مہمان نوازی سے کام نہ لے تو "ڈیڈ بال" پر بھی چھکا مار سکتا ہے۔ اس سے بھی آگے کی بات کریں تو آپ جان لیں کہ یہ دلیری، جوش، ولولہ اور جذبہ محض ایک شاہد آفریدی تک ہی محدود نہیں ہے۔ اس میدان میں "خانوں" سے آگے "خاں" اور بھی ہیں۔ جی ہاں! آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں۔ بلا مبالغہ ہمارے پٹھان بھائیوں میں ایسے ایسے شہ زور، بہادر اور جری موجود ہیں جو کرکٹ تو ایک طرف ہاکی اور کبڈی میں بھی چھکے مارنے اور چھکے چھڑانے سے دریغ نہیں کرتے۔ خاص طور پر کبڈی میں جہاں اکثر ان کی دلچسپی پوائنٹ سکورنگ یا مخالف کھلاڑی کو "جپھا" مارنے سے زیادہ "جن جپھا" مارنے میں ہوتی اور بدقسمتی سے اگر کوئی مخالف کھلاڑی ایک بار ان کے جپھے میں آ گیا تو سمجھ لیں اُس کی حالت میاں محمد بخشؒ کے اِس شعر کی مانند ہوگی

" پھس گئی جان شکنجے اندر جیوں ویلن وچ گنا
رہوں نوں کہو ہُن رہو محمد ہُن رہوے تے منا"

"قیدی" کی رہائی اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک خان صاحب خود "بور" نہ ہو جائیں۔ بھلے اُس وقت تک خان صاحب کی بلا سے اُن کے آہنی شکنجے میں مخالف کا رس نکل جائے۔ خیر اس بات کو یہیں پُر ختم کرتے ہیں اس لئے کہ بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی۔ یوں بھی ساحر لدھیانوی کی اس بات میں خاصا وزن ہے

"وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن
اُسے اک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا"

نئی بات یہ ہے کہ گذشتہ دنوں ہمیں انچارج ایف ایم 101 ریڈیو پاکستان محترمہ نزاکت شکیلہ کی مہربانی سے پاپولیشن کونسل کے زیر اہتمام بھوربن میں تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے تناظر میں "رول آف میڈیا ان سوشل چینج" کے عنوان کے تحت دو روزہ ورکشاپ میں شرکت کا موقع ملا۔ اس میں لاہور اور پشاور کے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا سے وابستہ نوجوان مرد و خواتین صحافیوں نے شرکت کی۔ لاہور سے ہمارے ساتھ پاکستان میں وائس آف جرمنی کے نمائندے سینئر صحافی تنویر شہزاد اور ریڈیو پاکستان کے سینئر پروڈیوسر زبیر بشیر تھے جن سے ہمارا بے تکلفانہ یارانہ ہے لہٰذا یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ دو دن ہم نے شہر کے شور شرابے اور دفتر کی مصروفیات سے دور پُر سکون اور پُر فضا پہاڑی مقام پر نئے دوستوں کی ہمراہی میں کتنے خوشگوار گزارے۔ اس دوران نئے دوستوں سے ملنے، انہیں قریب سے جاننے اور ان سے کچھ سیکھنے کا موقع بھی ملا جو یقیناً ایک نیا اور یادگار تجربہ تھا۔ بقول پاپولیشن کونسل کی ڈپٹی ڈائریکٹر پروگرام سیمی اشفاق شہر سے دور شور شرابے سے پاک پُر فضا مقام پر ورکشاپ کے انعقاد کا ایک مخفی مقصد

شرکائے ورکشاپ کو اصل موضوع کی طرف توجہ دلانے اور تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی سے ہونے والے نقصانات کے سدِ باب میں اپنا کردار ادا کرنے کی جانب مائل کرنے کے ساتھ ساتھ دوستوں کو ایک خوشگوار تفریح کا موقع بھی فراہم کرنا تھا تاکہ وہ آئندہ کے لئے تازہ دم ہو کر ایک نئے ولولے اور عزم کے ساتھ میدانِ عمل میں نکل سکیں۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ذاتی طور پر ہم نے اس ورکشاپ سے کیا سیکھا تو اس کے جواب میں ہمارا جواب بھی اس سیانے بزرگ سے ملتا جلتا ہے جس سے کسی نے پوچھا تھا کہ بابا جی! دنیا میں دوست اور دشمن کی پہچان کیسے کی جائے؟ بابا جی بات سن کر ہلکے سے مسکرائے پھر انہوں نے جیب سے ماچس نکالی اُسے کھولا اور اُس میں سے دو تیلیاں نکالیں۔ ایک کو واپس ماچس میں رکھ کر دوسری کے دو ٹکڑے کیے اور اگلا حصہ پھینک کر پچھلے حصے کو کان میں پھیرتے ہوئے جواب دیا

" پُتر! ایناتے میتوں وی"

لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اگر چہ اس مسئلے کے ہمیں کچھ پتا نہیں تو ورکشاپ کے دیگر شرکاء بھی ہمارے جیسے ہی "نِہلے" تھے۔ کانفرنس کے شرکاء کی اکثریت گو نوجوان صحافیوں پر مشتمل تھی لیکن موضوع کے حوالے سے جس سنجیدگی اور دلچسپی کا مظاہرہ ان سب کی طرف سے دیکھنے میں آیا اس نے ورکشاپ کو بھرپور مثبت نتائج کا حامل بنا دیا۔ جس میں ملک کو درپیش چیلنجز کی روشنی میں تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے نقصانات کے ساتھ اس کے تدارک اور اُس میں میڈیا کے تعمیری کردار پر سیر حاصل گفتگو کی گئی۔

ورکشاپ کے پہلے روز افتتاحی سیشن میں پاپولیشن کونسل کے ڈائریکٹر پروگرام علی محمد میر نے مختصر طور پر پاپولیشن کونسل کے اغراض و مقاصد اور کارگردگی بیان کی جس کے بعد شرکائے ورکشاپ نے باری باری اپنا تعارف کرایا اور پاپولیشن کی ڈپٹی ڈائریکٹر سیمی اشفاق نے خوبصورت انداز میں ورکشاپ کے انعقاد کی غرض و غائت بیان کی۔ ورکشاپ کے انعقاد میں یقیناً پاپولیشن کونسل کی ایک پوری ٹیم انتظامی امور میں شامل رہی ہوگی لیکن ورکشاپ کے آغاز سے اختتام تک جس دلجمعی اور توجہ سے محترمہ سیمی اشفاق نے اپنی ذمہ داریوں کو احسن انداز میں نبھایا وہ قابل تحسین تھا۔ موضوع کے حوالے سے تنویر شہزاد کی پریذینٹیشن بھی اپنی جگہ بھرپور تھی لیکن ممتاز دانشور اور سابق وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات جاوید جبار کا "بیان" خاصے کی چیز تھا۔ اُن کا اندازِ گفتگو ایسا پُر اثر اور دل موہ لینے والا تھا کہ" میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

اپنے کام میں طاق اور ہوشیار کسی ماہر چرواہے کی طرح مجال ہے بلکہ حرام ہے جو انہوں نے اپنی گفتگو کے دوران ایک لمحے کے لئے بھی کسی کو "اِدھر اُدھر" دیکھنے یا سوچنے کا موقع دیا ہو۔ اُس پر قیامت اُن کا شرکاء سے باری باری یہ دلچسپ مگر ہمارے خیال میں" غیر پارلیمانی" سوال کہ کس کے کتنے بچے ہیں۔ ایک دفعہ تو ہمیں یوں لگا جیسے ہماری کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔ یکدم مورال اور بلڈ پریشر دونوں ایک ساتھ ہی" ڈاؤن" ہو گئے مگر پھر ہم نے اُس وقت شکر الحمدللہ کا کلمہ پڑھا جب پشاور سے آئے ایک دوست نے یہ بتایا کہ "ابھی تک" اُس کے سات بچے ہیں اور اُس کی شادی کو آٹھ سال ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم سات اور آٹھ کے حساب میں مزید پھنسے رہتے ہمارے سامنے بھی یہ سوال رکھا گیا۔ جواب میں ہم ابنِ انشا کے انداز میں ہنس دیئے، ہم چُپ رہے کیونکہ منظور تھا پردہ "مرا"۔ زیادہ اصرار پر ہم نے بمعہ جواز جھجکتے جھجکتے اپنے چار بچوں کا بتایا کہ "صاحب جب ہماری شادی ہوئی اُس وقت ہم خود بچے تھے، نادان تھے، ناسمجھ تھے اور سب سے اہم بات یہ کہ بے روزگار تھے۔ سو ازالے کی نیت کے ساتھ یہ گزارش ہے کہ ہمیں ایک عدد نیا چانس دیا جائے کیوں کہ اب ہم سمجھ دار ہیں، برسرِ روزگار ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ تازہ تازہ ہم نے پاپولیشن کونسل کا نمک کھایا ہے جسے حلال نہ کرنا ہم اپنے راجپوتی خون کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں مگر وائے قسمت! ہمیشہ کی طرح ہمارا یہ وار بھی بُری طرح خالی گیا اور بمعہ جاوید جبار صاحب تمام دوستوں نے اسے ہنسی میں اُڑا دیا جس کا ہمیں اس لئے بھی زیادہ دکھ ہے کہ اس ہنسی کو ورکشاپ میں شریک بالخصوص تمام خواتین صحافیوں کی بھرپور تائید حاصل تھی۔ شاید ایسے ہی کسی موقع کے لئے یہ کہا جاتا ہے، پسند اپنی اپنی نصیب اپنا اپنا۔ ایک بات یہ بھی بتانے کی ہے کہ ممتاز اینکر اور کالم نگار طلعت حسین جتنے "چارمنگ" اپنے ٹاک شوز میں دکھائی اور سنائی دیتے ہیں ویسا ہی با کمال اور پیارا اندازِ گفتگو اُن کا یہاں بھی تھا۔ مختصر یہ کہ ایک بھرپور اور کامیاب ورکشاپ تھی جس میں ایک انتہائی اہم سوال پر جو ہماری آئندہ نسلوں کی بقا کے لئے بے حد اہم ہے نہائت سنجیدگی سے ہر پہلو سے غور کیا گیا اس کا تمام تر کریڈٹ یقیناً پاپولیشن کونسل پاکستان کی انتظامیہ کو جاتا ہے، جس پر بلاشبہ وہ تحسین کی مستحق ہے۔

سید ریاض حسین زیدی کا فنی ارتقا - ذکرِ شہؐ والا

ارسلان احمد ارسل

مجید امجد کے شہر ساہیوال سے تعلق رکھنے والے سید ریاض حسین زیدی ایسے خوش نصیب نعت نگار ہیں جن کا ''مدحت'' کا سفر تیزی سے جاری و ساری ہے اور وہ منزل طیبہ کی طرف گامزن ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے روزِ ازل ہی سے زیدی صاحب کو نعت رسول مقبولؐ کے لیے منتخب کر لیا اور ان کے سینے کو عشق رسولؐ سے منور کر دیا۔ ایسے انسان بہت خوش قسمت ہوتے ہیں جن کا حوالہ نعت بن جاتی ہے۔ جناب حافظ مظہر الدین مظہرؒ کا یہ شعر میرے جذبات کی کیسی اچھی ترجمانی کرتا ہے:

جب ازل میں ہوئی تقسیم جمال و جلوہ
درِ محبوب سے کچھ خاک اٹھالی میں نے

یہ درِ محبوب سے اٹھائی ہوئی خاک ہی ہے جس کو اپنے چہرے پر مل کر زیدی صاحب نے اپنی جبین نعت روشن کر لی ہے۔

''ذکرِ شہؐ والا'' زیدی صاحب کا تیسرا نعتیہ مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں وارفتگی بھی ہے اور سرشاری بھی، ادب بھی ہے اور خلوص بھی۔ فنی چابک دستی بھی نظر آتی ہے اور موضوعات کا پھیلاؤ بھی۔ الغرض یہ کہ زیدی صاحب نے تمام ظاہری و باطنی خصوصیات سے اپنی نعت کو اتنا وسیع اور باوقار کر دیا ہے جس کی گونج ہمیشہ سنائی دیتی رہے گی۔ میری دعا ہے کہ زیدی صاحب کے پہلے دو مجموعوں بالترتیب ''ریاضِ مدحت'' اور ''جمال سید لولاک'' کی طرح یہ مجموعہ بھی محققین نعت، مبصرین نعت اور شائقین نعت سے داد حاصل کرے اور سب سے بڑھ کر بارگاہِ رسالت میں قبول ہو۔ آمین۔ آخر میں زیدی صاحب کی ایک نعت کے چند اشعار قارئین کی نذر:

ہر سمت مرے پھیل گیا نور کا ہالہ
سو جان سے پیارا مجھے ذکرِ شہؐ والا
جس ذات نے تاریکیوں سے جان چھڑائی
ہر عہد میں اس نام کی برکت کا اُجالا
کیا کام دکھایا ہے مرے اشہبِ فن نے
تائب نے مجھے نعت کے رستے پہ جو ڈالا
نسبت ہی ریاضِ دلِ افسردہ، وہ مانگو
ہر عہد کے آشوب سے ہے جس نے نکالا

محمد افضال حسین سہروردی

محمد افتخار شفیع

دنیا کے ہر مذہب اور عقیدۂ زندگی میں انبیاء کی آمد باسعادت ہوئی۔ کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی رسول نہ بھیجا گیا ہو۔ آپ ﷺ کی تعریف و توصیف کے لیے جو ذرائع اختیار کیے گئے ان میں سے ایک نعت خوانی بھی ہے۔ کسی عاشق صادق کی وارفتگی کے عالم میں لکھی گئی نعت کو خوش الحانی کے ساتھ پڑھنے کی روایت آج کے عہد میں قبولیت عام کے درجے پر فائز ہے۔ ایسے ثناخواں حضرات کی فہرست بنانا ناممکن ہے۔ ان بلبلانِ باغِ حجاز میں ایک محمد افضال حسین سہروردی بھی ہیں۔

محمد افضال حسین سہروردی 1977ء میں خطۂ علم و ادب ساہیوال میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج آف کامرس ساہیوال سے کسب علم کیا۔ نعت خوانی کا آغاز 1993ء میں کیا جب کہ اس وقت ان کی عمر صرف 15 برس تھی اور 1995ء میں باقاعدہ طور پر بین الاقوامی شہرت یافتہ ثناخوان مصطفیٰ الحاج پیر سید محمد فصیح الدین سہروردی کے شاگرد اور مرید ہوئے۔ نعت خوانی کی تربیت اور اسرار و رموز محترم قبلہ الحاج پیر سید محمد فصیح الدین سہروردی صاحب سے سیکھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت خوبصورت، دل نشین لحن داؤدی سے نوازا ہے۔ نعت خوانی کے طفیل ملک پاکستان میں ہونے والی مرکزی محافل نعت میں نمائندگی کر چکے ہیں۔

پاکستان کے علاوہ بیرونی ممالک بالخصوص بھارت، متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب میں بھی نعت خوانی کر چکے ہیں۔ پاکستان ٹیلی ویژن، ریڈیو پاکستان، ایف ایم ریڈیو اور دیگر نجی ٹی وی چینلز پر بھی نعت خوانی کے گل ہائے عقیدت پیش کر چکے ہیں۔

نعت خوانی کے طفیل حج بیت اللہ شریف اور متعدد بار عمرہ کی بھی سعادت حاصل کر چکے ہیں اور روضہ رسول ﷺ پر حاضری کا شرف بھی حاصل کر چکے ہیں۔ نعت خوانی ہی کی بدولت مختلف سرکاری، مذہبی اور علمی و ادبی تنظیموں کی جانب سے متعدد ایوارڈز حاصل کر چکے ہیں۔

محمد افضال حسین سہروردی ایک دردمند انسان ہیں۔ ایسے صاحب دل کہ آپ علم و ادب کی ترویج کے لیے ہر وقت پیش پیش رہتے ہیں۔ آپ کئی علمی و ادبی تنظیموں کے عہدیدار اور نگہبان ویلفیئر فاؤنڈیشن ساہیوال پاکستان کے صدر نشین بھی ہیں اور اس کے علاوہ سہروردیہ نعت فاؤنڈیشن انٹرنیشنل ساہیوال کے بھی صدر ہیں۔ آپ نعت خوانی اور علم و ادب کی ترویج و اشاعت اور فروغ کے لیے دل و جان سے کوشاں ہیں۔

افسانہ

صحرا اور ڈوبتا چاند

آدم شیر

انسان کا معدہ بڑی بری بلا ہے۔ یہی وہ بلا ہے جو دس سال کے شمس کو کھا گئی۔ وہ میرے ساتھ اس بلا سے بچنے کے لیے بھاگ رہا تھا۔ اس کا دوست حسن بھی ساتھ تھا جس کا کوئی مائی باپ نہ تھا۔ وہ شمس سے دس مہینے بڑا تھا اور میں ان دونوں سے سات آٹھ سال پہلے دنیا میں آیا تھا۔ میں نے شمس کے لیے فرار کا منصوبہ بنایا تھا جس میں حسن بھی شامل ہو گیا۔ وہ ڈیڑھ دن سے بھوکا تھا اور سمجھا ہم جہنم سے نکل کر جنت کی طرف جا رہے ہیں۔ جب اس کے پاؤں میں چلتے چلتے چھالے پڑے تو اسے پتا چلا کہ یہ راہ نہیں آسان لیکن اب وہ لوٹ بھی نہیں سکتا تھا۔

جب سورج آگ برساتا تو ریت کے ذرّے سچے موتیوں کی طرح چمکنے لگتے۔ حسن کے پاؤں میں پڑے چھالے یہ چمکتے موتی برداشت نہ کر پاتے اور وہ بار بار بیٹھ جاتا۔ تپتی زمین پر بیٹھ کر پاؤں ہاتھ میں پکڑ پکڑ کر دیکھتا۔ ابھی تو اسے لمبا راستہ طے کرنا تھا۔ ہاتھوں کے بل یا قدموں کے بل، جیسے بھی ہو۔ ہمیں جمعہ گوٹھ سے چلے تین دن ہونے کو تھے اور شمس کو مرے ابھی پونے دو دن ہوئے تھے۔ شمس دیکھنے میں بڑا سخت جان تھا۔ وہ شرارتیں بھی بڑی کرتا تھا لیکن بھوک نے اسے اسی طرح کھا لیا جیسے گندے پانی نے جمعہ گوٹھ کے کئی لوگ کھائے تھے۔

پیٹ بھی عجیب ہے۔ بھرا ہو تو نقصان خالی ہو تو اور بھی نقصان۔ کچھ الٹا سیدھا کھا لو تو ہیضہ ہو جاتا ہے۔ کچھ نہ کھاؤ تو انتڑیاں خشک ہو کر آپس میں الکل بیچو شروع کر دیتی ہیں اور انسان دوہرا ہو جاتا ہے۔ شمس بھی کئی بار دوہرا ہوا۔ وہ جب بھی دوہرا ہوتا مجھے تہرا چوہرا لگنے لگتا۔ وہ کمر کے بل لیٹتا، ٹانگیں پیٹ سے جوڑنے کی کوشش کرتا کہ پیٹ کے اندر نہیں تو چلو باہر ہی ماس لگ جائے۔ اس کی انتڑیاں الکل بیچو سے تھک کر نچڑنا شروع ہو گئی تھیں۔ ہم اسی سے بچنے کے لیے بھاگ گئے تھے۔ شمس کی قسمت خراب تھی وہ زیادہ دور تک نہ بھاگ سکا۔

شمس کے پیٹ میں جب عجیب و غریب چیزیں اٹھ اٹھ کر بیٹھ جاتیں تو وہ مسکراہٹ کا منہ چڑاتے ہوئے پوچھتا "ریت کھانے سے کچھ ہوتا تو نہیں" حسن اس کی بات سن کر ہنس پڑتا اور میں نہ رونے کی کوشش کرتا۔ میں تین افراد پر مشتمل اس مہاجر قافلے کا سربراہ جو ٹھہرا تھا۔ اس لیے میں رو نہیں سکتا تھا۔ جب حالات ہی ہم پر رو رہے تھے تو ہمیں رونے کی کیا ضرورت تھی۔ جب میں اور حسن شہر پہنچے تھے تو وہاں ٹی وی پر کئی لوگ ہمارے لیے رو رہے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ شمس خالی پیٹ روتا تھا اور ٹی وی پر رونے والوں کی جیبیں بھری ہوئی تھیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بھی رونا نہیں آیا تھا۔

جمعہ گوٹھ میں مرد روتے نہیں تھے۔ یہ مردانگی کا سوال تھا۔ یہاں ایک مردانگی ہی بچی تھی۔ ورنہ ہر سال گرمیوں میں جب سورج جوبن پر آتا تو پینے کو پانی ہوتا نہ کہیں گندم بچی ہوتی۔ ہمارے جانوروں کے لیے چارہ تک نہ بچتا۔ کتے بلیوں کا پتا نہیں، اگر گائے بھی گوشت خور جانور ہوتا تو وہ ایک دوسرے کو کھا کر گزارہ کر لیتیں۔ بھیڑیں ایک دوسرے کو اپنی رانیں درد دل کے واسطے ضرور پیش کرتیں لیکن وہ گوشت خور نہیں تھیں۔ ہم گوشت خور تھے۔ عید کے عید گوشت کھاتے تھے۔ جب قریبی شہر سے لوگ خیرات کرنے آتے۔

میں اپنی جھونپڑی کے باہر موٹی دری بچھائے، آسماں پر تاروں کا تعاقب کرتے، اکثر خود سے ایک سوال کیا کرتا تھا۔ "یہ شہر کے لوگ گرمیوں میں خیرات کرنے کیوں نہیں آتے؟" میرے پاس سوال کا جواب دینے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ خود ہی جواب سوچ لیتا کہ گرمیوں میں شہر کے لوگ بھی بھوک پیاس سے بیمار پڑ جاتے ہوں گے یا پھر انہیں کوئی اور پریشانی ہوتی ہو گی ورنہ ہماری خبریں ہوا کے دوش پر اڑتی اڑتی ان تک پہنچتی ضرور ہوں گی۔ پچھلے سال گرمیوں میں شہر والوں کی راہ تکتے تھک گیا تو خود شہر جانے کا سوچا۔ یہی وقت صحیح تھا۔ جمعہ گوٹھ سے کئی لوگ جا رہے تھے تو مجھے بھی جانا ہی چاہیے تھا۔

ہم سندھو دیس کے بیٹے ہیں۔ یہ پانی کے ایک عظیم دیوتا کی خواب گاہ ہے۔ جو کبھی ایک آنکھ کھول کر اردگرد دیکھتا ہے اور کبھی دونوں آنکھیں کھول لیتا ہے۔ کبھی ہڑبڑا کر اٹھ بھی جاتا ہے۔ یہ ہم پر کرم کی نظر کرتا ہے نہ کوئی اسے ہم تک لانے کی کوشش کرتا ہے۔ میرے دادا کہتے تھے کہ اگلے وقتوں میں ایک بہادر ساری رات پانی کے دیوتا سے لڑتا رہا۔ دیوتا نے کئی بار اسے چاروں شانے چت کیا لیکن پھر وہ کھڑا ہو جاتا۔ دیوتا اسے دور دور پھینکتا، وہ پھر جا چمٹتا۔ شب بھر بدمست سانڈ کی طرح ٹکراتا رہا۔ سر ٹکراتے ٹکراتے رات گزرنے والی تھی۔ سورج کی پہلی کرن کے رات کی سیاہی کا سینہ چیر کر اس تک پہنچنے سے پہلے اور زندگی کی بازی ہارنے سے کچھ لمحے قبل اس نے دیوتا کا دل جیت لیا۔ اب تو مشینیں ہیں بڑی بڑی، کوئی ان مشینوں کو ہی دیوتا سے لڑا دے۔

ہم صحرا کے بچے ہیں جو پانی کے لیے جھولیاں پھیلائے رکھتے ہیں۔ آسمان کی طرف دیکھتے رہتے ہیں لیکن آسمان چند برس سے ہماری طرف نہیں دیکھ رہا۔ جب آسمان ہی نہیں دیکھ رہا تو کوئی اور کیا دیکھے گا

لیکن میں نے دیکھا۔ میں نے شمس کو مرتے ہوئے دیکھا اور بھی کئی لوگوں کو دیکھا لیکن شمس کو مرتے ہوئے دیکھنا کچھ عجیب تھا۔ شمس جب مر رہا تھا اس کے گلے کے قریب ایک ہڈی نظر آنے لگی تھی۔ مجھے بعد میں پتا چلا یہ ہڈی عورتوں کی نظر آئے تو حسن کی نشانی ہوتی ہے۔ جمعہ گوٹھ اور آس پاس کے کئی گوٹھوں میں حسن بکھرا پڑا تھا۔ یوں کہنا چاہیے کہ حسن بکھر بکھر رہا تھا، جیسے شمس بکھر گیا۔ بچھڑ گیا تھا۔ پہلے وہ مائی سکینہ سے بچھڑا تھا جس سے سائیں ذوالفقار یعنی میرا باپ کئی سال پہلے بچھڑ چکا تھا۔ مائی سکینہ کی ہڈی بھی نظر آتی تھی۔ اس کے بازوؤں میں پڑی چوڑیاں چوڑی ہوگئی تھیں۔ چوڑیوں کے نیچے سے بھی ہڈی نظر آتی تھی۔ جب وہ مری تھی تو اس کے چہرے پر وہ ہڈیاں نظر آ رہی تھیں جن کے اوپر ماس ہو تو ننھے منے گڑھے پڑتے ہیں۔

مائی سکینہ کے پاس ایک ریڈیو تھا جو سائیں ذوالفقار شہر سے لایا تھا۔ وہ ایک بار شہر گیا تھا دوبارہ جانا چاہتا تھا لیکن کبھی جا نہیں سکا تھا۔ پچھلے سال گرمیوں میں جن دنوں آسمان ناراض تھا مائی سکینہ کے ریڈیو پر ایک خبر چلی تھی کہ سندھو دیس کے آقا گندم کی بوریاں، صاف پانی کی بڑی بڑی بوتلیں اور دوائیاں صحرا کے بچوں کے لیے بھیج رہے ہیں۔ مائی سکینہ بڑی خوش ہوئی تھی۔ میں خوشی سے ناچا تھا۔ جمعہ گوٹھ میں یہ خبر سن کر ہر کوئی خوش ہوا تھا لیکن کئی خوشی سے ہی مر گئے۔ مائی سکینہ بھی ان میں سے ایک تھی۔

مائی کے مرنے کے بعد مجھے اور شمس کو کچھ دن آس پاس سے کھانے کو ملتا رہا۔ ان دنوں میں کھلے آسمان تلے تاروں کا تعاقب زیادہ کرنے لگا تھا۔ تارے موٹی موٹی بوٹیوں کی طرح نظر آتے، جب دور چلے جاتے تو روٹی کا روپ دھار لیتے۔ چاند کبھی روٹی کے سخت کناروں کی طرح نظر آتا اور کبھی آدھی روٹی لگتا۔ یہ کافی دن پہلے پوری روٹی کی طرح تھا لیکن ایسا وقت آ پہنچا کہ پوری روٹی آتی نہ آدھی ملتی۔

کب تک کوئی تاروں کے پیچھے بھاگ سکتا ہے۔ ایک دن ہر کوئی تھک ہی جاتا ہے۔ میں بھی تھک گیا۔ شمس کو ساتھ لیا۔ ہر وہ شے جو قیمتی لگی تھیلے میں ڈال کر ساتھ لے لی۔ میں تھیلا کندھے پر ڈالے شمس اور حسن کے درمیان امام کی طرح چلتا رہا۔ تین گوٹھوں میں ٹھہرنے کے بعد ہمارے پاس تھیلا رہا تھا نہ شمس۔ میں اور حسن پھر بھی چلتے رہے۔ راتوں کو آسمان پر تارے شمس کی طرح میرا منہ چڑاتے۔ دن کو آگ کا دیوتا آنکھیں دکھاتا۔ ہم ٹیڑھا منہ اور سرخ آنکھیں دیکھ دیکھ کر چوتھے گوٹھ پہنچے۔ یہاں لمبی داڑھیوں والے کچھ لوگ روٹیاں دے رہے تھے۔ وہ لوگوں کو پانی بھی دیتے۔ ان کے پاس گوشت تھا جو تھوڑا تھوڑا سب کو ملتا۔ ہمیں بھی ملا۔ حسن اتنا کچھ دیکھ کر پاگل ہو گیا۔ اس نے معدے میں زیادہ ٹھونس لیا اور بیمار پڑ گیا۔ داڑھی والے لوگوں کے پاس دوائیاں بھی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا۔

''کیا تمہیں سندھو دیس کے آقا نے بھیجا ہے؟'' ان میں سے بڑھاپے کو گلے لگانے والے ایک شخص نے مسکراتے ہوئے کہا کہ وہ کون ہے؟ میں حیران ہو گیا کہ یہ بوڑھا ہو گیا ہے اور اسے سندھو دیس کے آقا کا نہیں پتا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ سندھو دیس کا آقا وہی ہے جس نے ہمارے لیے گندم کی ڈھیروں بوریاں، پانی کی بڑی بڑی بوتلیں، گوشت کے تھیلے اور دوائیاں بھیجی ہیں۔ اب حیران ہونے کی اس کی باری تھی۔ میں نے اسے زیادہ حیران نہیں رہنے دیا اور پوچھا۔

''تم لوگ جمعہ گوٹھ کب جاؤ گے؟''

وہ بکھری بکھری داڑھی والا بوڑھا تھوڑا پریشان ہو گیا اور پھر ایسے بولا جیسے شرمندہ ہو۔

''ہمارے پاس سامان تھوڑا ہے جمعہ گوٹھ بہت دور ہے۔ دوبارہ سامان اکٹھا کر کے وہاں جائیں گے۔'' مجھے تھوڑا غصہ آیا کہ تب تک تو ہمارے آقا کی گندم بھی پہنچ جائے گی۔ یہ بات میں نے اس سے نہیں کہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کب واپس شہر جائیں گے۔ وہ جلد واپس جانے والے تھے۔ میں نے منت کی کہ مجھے اور حسن کو بھی ساتھ لے جائیں۔ انہوں نے انکار کر دیا لیکن میں نے پیچھا نہیں چھوڑا جس پر انہوں نے ہمیں کچھ روپے دے دیے اور ایک پتا بتا دیا۔

ہمارے لیے داڑھی والوں کا دیا ہوا سامان اور روپے چاند سے زیادہ چمکدار تھے۔ جن سے ہم کچھ دن بعد سندھو دیس کے مرکز پہنچ گئے۔ یہاں ہم داڑھی والوں کے پاس رہتے ہیں۔ میں چھوٹے موٹے کام کرتا ہوں۔ حسن قرآن پاک پڑھتا ہے۔ رہنے کے لیے جگہ ہے۔ کھانے کو ملتا ہے اور پانی بھی صاف ہوتا ہے۔ یہاں قریب ہی ایک دکان پر ٹی وی ہے، جس پر ہمارا آقا نظر آتا ہے جو کہتا ہے کہ زندگی ایک تحفہ ہے۔

میں اکثر خود سے پوچھتا ہوں کہ شمس سے یہ تحفہ کس نے چھینا؟ پانی کے دیوتا کا سینہ چیر کر دل نکال لوں جو ہم سے دور دور رہتا ہے۔ آسمان کو الزام دوں جس نے ہم پر کرم کی نظر نہیں کی یا پھر خود کو مجرم ٹھہراؤں جو چھوٹے بھائی کو سنبھال نہیں سکا۔ آقا کی گردن پکڑوں یا وڈیرے کا گریبان چاک کروں یا پھر ان سب کا پیٹ پھاڑ دوں جن کے گھر تحائف سے بھرے پڑے ہیں؟ مجھے صحیح طرح پتا نہیں کہ کون بری الذمہ ہے۔ مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ زندگی واقعی ایک تحفہ ہے چاہے جیسی بھی ہو۔ یہ خدا نے دی ہے، واپسی بھی اسی کا حق ہے۔ اب میں تاروں کا تعاقب نہیں کرتا۔ خود سے یہ بھی نہیں پوچھتا کہ شہر کے لوگ گرمیوں میں جمعہ گوٹھ خیرات کرنے کیوں نہیں آتے۔ اب میں خود شہر میں رہتا ہوں۔

پگلی

نسیم سکینہ صدف

وہ پگلی تھی۔ گاؤں والے اسے پگلی کہہ کر ہی پکارتے تھے۔اس کا کوئی دوسرا نام نہ تھا۔وہ کہاں سے آئی تھی،؟اس کے ماں باپ کون تھے؟اس گاؤں میں کیسے پہنچی؟یہ بھی کوئی نہیں جانتا تھا وہ کبھی کسی کی بات کا جواب نہیں دیتی تھی اور جب کوئی اسے سوال پوچھنے کی کوشش کرتا تو وہ شک کی نگاہوں سے اُسے دیکھتی اور بھاگ جاتی۔ پگلی کا ایک دوست اُس کا کتا تھا۔ جو چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہتا تھا پگلی کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتا اور اسے دیکھ کر دم ہلاتا رہتا۔ پگلی تو جب کھانے کے لیے کوئی روٹی یا دال ملتی تو وہ آدھی اپنے کتے کو دیتی اور آدھی خود کھاتی کئی دفعہ وہ کتے کو آدھا گنا۔ اور آدھی مکئی کی چھلی بھی زبردستی کھلانے کی کوشش کرتی گرمیوں میں وہ اور اس کا کتا درخت کے تلے کھاد کے ڈھیر پر سو جاتے اور سردیوں میں نہ جانے کہاں سوتے مائیں اپنے بچوں کو ڈرانے کے لیے کئی بار کہتیں۔

"وہ پگلی آئی سو جاؤ نہیں تو اٹھا کر لے جائے گی"

لیکن گاؤں کے کچھ بچے ایسے بھی تھے اکثر بیروں کے موسم میں پگلی کے پاس بیٹھے ہوئے نظر آتے اور وہ اپنی جھولی میں سے پکے پکے بیر نکال کر انہیں دیتی مگر جس وقت کوئی بڑا آدمی پاس آتا تو وہ بھاگ جاتی ان چھوٹے دوستوں میں آٹھ سال کا ایک جاوید نامی تھا جو اس کا گہرا دوست تھا وہ کئی بار کھاد کے ڈھیر پر اکیلا بیٹھ کر پگلی سے باتیں کرتا اور جب اس کے دوست اس سے پوچھتے" تم پگلی سے کیا کہہ رہے تھے تو وہ جواب دیتا پگلی مجھے کہانی سنایا کرتی ہے گاؤں کے بچے اسے "پگلی کا یار" کہہ کر چھیڑتے مگر جاوید پر کوئی اثر نہ ہوتا وہ گھر سے پگلی کے لیے اپنے حصے میں سے روٹی چنے اور گڑ لے جاتا اور پگلی اس کو خوب صورت پتے اور رنگ برنگے پرندوں کے پر دیتی۔ایک رات گاؤں میں شور مچ گیا آگ آگ لوگ بالٹیاں اور گھڑے پانی کے لے کر اکٹھے ہو گئے۔ پگلی بھی کہیں سے آ کر کھڑی ہو گئی اور تماشہ دیکھنے لگی۔ وہ کبھی لوگوں کو دیکھتی اور کبھی آگ کے شعلوں کو دیکھ کو ہنستی۔ گھر والے چیخ رہے تھے۔اتنے میں زور سے چیخ مار کر کسی نے کہا۔جاوید کہاں ہے وہ گھر کے اندر ہے آگ تیزی سے بھڑک رہی تھی۔جاوید کا نام سنتے ہی پگلی ادھر اُدھر دیکھنے لگی جاوید کی ماں چیخیں مار رہی تھی۔ مکان کے سب حصے شعلوں میں لپٹے ہوئے تھے۔پگلی نے جاوید کا نام ایک دفعہ پھر سنا۔اور بھاگ کر جلتے ہوئے گھر کے اندر گھس گئی۔ لوگ حیران کھڑے دیکھ رہے تھے۔اور پگلی کا کتا بے تابی سے بھونک رہا تھا۔

پانچ منٹ کے بعد پگلی باہر بھاگ آئی گود میں جاوید ایک موٹی دری میں لپٹا ہوا تھا۔پگلی کے بال اور کپڑے جل رہے تھے۔ وہ درد سے کراہ رہی تھی۔ کتے نے اسے دیکھ کر اچھلنا شروع کر دیا۔ پگلی کا منہ بری طرح سے جھلس گیا تھا۔لوگوں نے کپڑے سے اس کے سر اور کپڑوں کی آگ بجھا دی جاوید کی ماں نے اس کو گود میں اٹھا لیا۔اور اس کے زخموں کو دیکھنے لگی کئی لوگوں نے پگلی کو پکڑ کر مرہم پٹی کرنی چاہی مگر وہ پوری طاقت سے اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگ رہی تھی بہت مشکل سے اس کے زخموں پر پٹی باندھی گئی اور وہ جا کر کھاد کے ڈھیر پر لیٹ گئی کتا بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔گاؤں والے اس کے پاس کھانا پانی اور دودھ رکھ گئے کہ شاید ان کے جانے کے بعد کھا پی لے مگر پگلی درد سے بہت نڈھال ہو رہی تھی اس میں اُٹھنے کی یا کھانے کی طاقت نہ تھی۔

دوسرے روز گاؤں والوں نے آ کر دیکھا تو کھانا ویسا ہی پڑا تھا۔ کتے نے بھی کسی چیز کو منہ نہیں لگایا تھا اور بدستور پگلی کا منہ دیکھ رہا تھا گاؤں والوں نے اسی طرح تازہ کھانا اور پھل رکھ دیے کتے کے لیے بھی دودھ رکھا مگر دوسری دن بھی وہ کھانا ویسا ہی پڑا پایا تیسرے دن کتا بھی کمزور ہو کر پاس لیٹا ہوا تھا گاؤں کی عورتیں اور بچے آس پاس بیٹھے تھے آنکھوں میں آنسو تھے۔لیکن سب بے بس تھے ہسپتال بہت دور تھا۔اور پگلی کو کوئی ہاتھ بھی لگائے تو وہ چلاتی تھی گاؤں میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ادھر جاوید کا علاج ہو رہا تھا۔

چوتھے روز صبح کچھ لوگ وہاں پہنچے تو کتے کو مرا ہوا پایا پگلی کا ہاتھ اس کے اوپر تھا اور پگلی بھی مر چکی تھی۔کھاد کے ڈھیر کے پاس اس کی قبر بنائی گئی۔اس طرح سے پگلی نے جاوید کی خاطر اپنی جان قربان کر دی اور ایثار کی زندہ مثال قائم کر دی۔

''میری مہوڈنڈ جھیل......!''

روبنسن سیموئل گل/ راول پنڈی

جب آپ دور دراز کے خوبصورت مقامات کو دیکھتے ہیں تو اسی نظر سے دیکھیں کہ شاید آپ دوبارہ کبھی یہ منظر نہیں دیکھ سکیں گے۔ اس منظر کو اپنی آنکھوں میں، اپنے تصور کی دنیا میں قید کرلیں۔ یقین کیجیے آنے والی زندگی میں وہ خوبصورت اور دلفریب منظر آنکھیں بند کرتے ہی آپ کو ایسا راحت انگیز تجربہ دے گا جو ناقابل بیان ہوگا۔ کسی خوبصورت منظر کو ضائع نہ ہونے دیں۔ تصور کی آنکھ سے وہی منظر آپ کو دوبارہ سے خوشی اور تسکین عطا کرے گا۔ اگر آپ اُس خوبصورت منظر کو دیکھنے کے لیے جسے آپ نے تصویر کی شکل میں یا اپنے تصور کی قید میں محفوظ کر رکھا ہے۔ دوبارہ جائیں تو شاید وہ وہاں پر ویسا نہ ہو جیسا آپ نے اُس کو پہلی بار پایا تھا۔

میں آٹھ سال بعد کالام پہنچا تو دریا میں لگی چارپائیوں والا منظر بدل چکا تھا۔ اب وہاں ایسا کچھ نہ تھا جیسا میں نے 1998 اور پھر 2004 میں دیکھا تھا۔ گوڈاک پارک بھی باقی نہ رہا تھا۔ سب کچھ 2010 کے ناقابل فراموش سیلاب کی نذر ہو چکا تھا۔ آپ کہیں بھی دوبارہ چلے جائیں وہ جگہ ویسی نہیں ہوتی جیسے پہلے تھی۔ بہت کچھ بدل چکا ہوتا ہے۔ اگر آپ کو کچھ بدلا ہوا نہ بھی محسوس ہو تو بھی اب آپ بدل چکے ہوں گے۔ آپ ویسے نہیں ہوں گے جیسے پہلے تھے۔

جب 1998 میں میں کالام سے جیپ کے ذریعے سفر کرتے ہوئے مہوڈنڈ جھیل پہنچا تھا تو وہ خوبصورت اور دل فریب منظر میرے اندر جذب ہو گیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ میں نے اس منظر کو اپنے تصور میں قید کرلیا ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ میں اُس کا اسیر ہو چکا تھا۔ اس کے حسن، اس کے عشق کا اسیر ہو چکا تھا۔ کئی بار مہوڈنڈ جھیل کے نیلگوں پانی، تروتازگی سے بھری سرسبز گھاس، اُس گھاس پر بڑے اطمینان اور سکون سے چرتے ہوئے لمبے لمبے بالوں والے خوبصورت لشکتے ہوئے گھوڑے جو اُس سارے منظر کا حصہ تھے اور خود مہوڈنڈ جھیل مجھے اپنے پاس بلاتی تھی۔ ایک بار نہیں بلکہ کئی بار۔

2004 میں جب میں اور میری اہلیہ کرن شادی کے بعد ہنی مون کے لیے گئے جس دورے کے اختتام پر ایک زبردست کہانی ''مسافر خان'' وجود میں آئی۔ تب بھی میری شدید خواہش تھی کہ میں کرن کو وہ منظر دکھاؤں۔ اپنی محبوبہ مہوڈنڈ جھیل سے ملواؤں جس نے مجھے اسیر کر رکھا تھا۔ مگر آبشار کے مقام سے آگے برف کے باعث راستے بند تھے اور جیپ کا ڈرائیور مسافر خان ہمیں مہوڈنڈ جھیل تک نہ لے جاسکا۔ اُس ٹرپ سے ہم نے بھرپور لطف اُٹھایا۔ گوڈاک پارک اور دھماکہ جھیل بھی دیکھے جو 1998 میں وہاں موجود نہ تھے۔ دھماکہ جھیل آسمانی بجلی گرنے سے وجود میں آئی تھی۔ ان مقامات کو اپنی نو بیاہتا دلہن کے ہمراہ دیکھنے کے باوجود ایک تشنگی پھر بھی باقی رہ گئی تھی کہ میں مہوڈنڈ جھیل کی قربت میں نہ جاسکا۔ اُسے چھو نہ سکا۔ اُس کا دیدار حاصل نہ کر سکا۔ تاہم ایک خیال آتا تھا کہ وہ جھیل تو ادھر ہی ہے۔ زندگی نے وفا کی تو ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب میں ''میری مہوڈنڈ جھیل'' کی رفاقت میں چند لمحات گزار سکوں گا۔ مگر افسوس کہ پھر سوات اور کالام کے علاقے حالت جنگ میں چلے گئے۔ طالبان نے کنٹرول سنبھال لیا۔ تب بھی خیال آتا تھا کہ اب وہ موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ میری مہوڈنڈ جھیل کسی اور کی اسیر ہو چکی ہے۔ اُسے پھر سے دیکھنے کی تشنگی، اُس کے پانیوں کو چھونے، اس کی سرسبز گھاس پر چلنے کی آرزو اب عمر بھر دل میں ہی رہ جائے گی لیکن آخرکار یہ خواب سچ کا رُوپ دھار کر 2012 میں شرمندۂ تعبیر ہو ہی گیا۔ بھلا ہو پاکستان آرمی کا جو ڈٹے رہے اور آخرکار سوات کے علاقے کو آزاد کروا لیا۔ میرے مہوڈنڈ کو بھی آزاد کروالیا۔ باقی ماندہ کسر خدا نے 2010 کے فوق الفطرت سیلاب کے ذریعے پوری کردی۔ تمام علاقہ کلیئر ہوگیا۔ 2011 میں وہاں جنگ اور سیلاب کے بعد کی تباہ کاریوں کی بحالی میں صرف ہوا۔ سیاحوں کے ذہنوں سے نفسیاتی خوف اُترنے میں بھی کچھ عرصہ لگ گیا۔ 2012 میں کالام کو ایک بار پھر سیاحت کے لیے کھول دیا گیا۔ دیگر سیاحتی گروہوں کی طرح ہم پانچ جوانوں کا گروپ جن میں میرے ہمراہ شیراز صادق، ذیشان ریاض، جبران فیس اور سنیل سرفراز شامل تھے۔ کالام کی جانب روانہ ہوئے اور اپنی سفید کیری وین RIA 2154 پر تقریباً ڈیڑھ درجن آرمی چیک پوسٹوں کو کراس کرتے اور اپنی شناخت کرواتے کرواتے آخرکار دس بارہ گھنٹے کے سفر کے بعد رات گیارہ بجے تاریکی میں ڈوبے کالام پہنچ

گئے اور پھر میں ان جوانوں کو اگلے ہی روز اپنے ہمراہ لیے مہوڈنڈ جھیل کی جانب رواں دواں ہو گیا۔

کالام بہت بدل چکا تھا۔ وہاں ''منجی دریا ہوٹل'' بھی نہ تھا (دریائے سوات میں چارپائیوں والا ہوٹل جس میں آپ دریا کے پانی میں پاؤں بھگوئے چارپائیوں پر بیٹھے چکن کڑاہی، چپل کباب اور لذیذ ٹراؤٹ مچھلی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں)۔ اب وہاں جیپیں نہ تھیں...... مسافر خان بھی نہ تھا...... اُس بابے کا کھوکھا نما ہوٹل بھی اپنا وجود کھو چکا تھا...... اور کون جانے ''مسافر خان'' کہانی والا بابا بھی تھا یا گزر چکا تھا جس کی سبز کھٹارا جیپ کا مسافر خان ڈرائیور تھا۔ اب وہ جیپ بھی کہیں دکھائی نہ دیتی تھی۔ بلکہ کوئی جیپ بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ اُن کی بجائے پجارو، لینڈ کروزر اور بڑی بڑی قیمتی نان کسٹم گاڑیاں نقل و حرکت کرتی دکھائی دیتی تھیں۔ اب یہاں آپ کو ہر جانب ٹیوٹا سپر سٹر دوڑتی نظر آتی ہیں۔ ہم بھی سفید رنگ کی لینڈ کروزر میں بڑے سکون سے بیٹھے مہوڈنڈ کی جانب سفر کرتے تھے۔ مجھے مسافر خان کی جیپ یاد آتی تھی جو کسی ایڈونچر سے کم نہ تھی اب تو بڑا آرام دہ سفر تھا۔

مجھے خدشہ تھا کہ اتنی تبدیلیاں ہوئیں، اتنا سب کچھ بدل گیا۔ کیا میری مہوڈنڈ جھیل ویسی ہی ہوگی جو تعریفوں کے پل میں نے ان نوجوانوں کے سامنے باندھے ہیں۔ کیا یہ بھی مہوڈنڈ جھیل کو اسی نظر سے دیکھ پائیں گے یا نہیں۔ کیا اس کے پانی اب بھی نیلگوں ہوں گے۔ کیا اب بھی نیلے آسمان میں تیرتے سفید بادلوں کے ٹکڑوں کا عکس جھیل کے پانی میں جزیروں کی مانند دکھائی دے گا۔ کیا سرسبز گھاس اُسی طرح ترو تازہ ہوگی۔ میں اس منظر میں سے خوبصورت لشکتے ہوئے گھوڑوں کو بھی الگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ اس منظر میں زندگی کی علامت تھے۔ ہلکی ہوا میں سرسراتی ہوئی گھاس، نیلے آسمان میں اُڑتے سفید بادلوں کے ٹکڑے، ہوا میں اُڑتے پرندے، جھیل کی سطح پر ہوا سے ہلکی ہلکی سی لہروں کی صورت حرکت کرتا پانی، سب کچھ تو زندگی کی علامتیں تھیں۔ میں ان میں سے کسی شے کو بھی مہوڈنڈ جھیل سے الگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس منظر سے الگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہی سوال مجھے فکر میں مبتلا کرتا تھا ''کیا وہاں سب کچھ پہلے جیسا ہوگا جیسا میں نے چودہ برس پیشتر دیکھا تھا۔ جب سرفراز کھوکھر صاحب کی سربراہی میں سہیل انجم، پارس گل صاحب اور اپنے یونیورسٹی کے دوست عامر سلیم کے ہمراہ آیا تھا اور مہوڈنڈ کو قید کر کے لے گیا تھا یا شاید اُس کا اسیر ہو کر واپس لوٹا تھا اور تب سے اُسی اسیری میں تھا۔

چودہ برس کی قید کے بعد میں رہا ہونے جا رہا تھا۔ آزاد ہونے والا تھا...... میں بھی مہوڈنڈ جھیل کے خوبصورت منظر کا حصہ بننے والا تھا اور آخر پہاڑی راستے کے اختتام پر ہم ایک موڑ مڑے اور ہم سب جھیل مہوڈنڈ کے اُس منظر میں داخل ہو گئے۔ سب نے یک زبان ہو کر یہی کہا:

''Wow کیا بات ہے؟''

واقعی مہوڈنڈ جھیل کی خوبصورتی اُسی طرح برقرار تھی۔ اُس کا حسن چودہ برسوں کے نشیب و فراز کے باوجود ماند نہیں پڑا تھا۔ وہی نیلگوں پانی جس پر ایک عجیب اور سحر انگیز ٹھہراؤ تھا۔ اس بار نیلے آسمان میں سفید بادلوں کے ٹکڑے جزیروں کی مانند حرکت نہیں کرتے تھے۔ بلکہ انہوں نے آسمان کو چھپا رکھا تھا اور حرکت کرنے کی بجائے وہ برس رہے تھے۔ ہلکی ہلکی بونداباندی جاری تھی۔ سرسبز گھاس میں آج بھی ترو تازگی تھی اور اُس پر چند گھوڑے، وہی خوبصورت، شاندار لشکتے ہوئے گھوڑے سر جھکائے اپنے پیٹ کی آگ بجھاتے تھے۔ یہ گھوڑے وہی تو نہیں ہو سکتے تھے جو چودہ برس پیشتر تھے۔ پانی بھی تو وہ نہ تھا وہ تو بہتا بہتا کب کا سمندر میں غرق ہو چکا ہوگا۔ گھاس بھی تو وہ والی نہ تھی۔ مگر پھر بھی سب کچھ ویسا ہی تھا۔ گوڈاک پارک اور منجی ہوٹل اور بابے کی خستہ حال ہوٹل کی طرح مہوڈنڈ جھیل نے اپنا وجود کھو نہیں دیا تھا بلکہ اب بھی برقرار رکھے ہوئے تھی۔ چلیں مان لیتے ہیں کہ مہوڈنڈ جھیل بالکل نہیں بدلی تھی۔ وہی منظر جو چودہ برس پیشتر میں نے جیسا چھوڑا تھا اب بھی ویسا ہی تھا مگر ایک بہت خاص بات واقع ہو چکی تھی۔ وہ یہ کہ اب میں بدل چکا تھا۔ میں ویسا نہ تھا جیسے چودہ برس پیشتر تھا۔ اُس وقت اپنے ہمراہ کاغذ قلم رکھنے کے باوجود میں مہوڈنڈ جھیل کو چند شاندار اور دل کو چھو جانے والے الفاظ میں نہ پرو سکا تھا۔ میں نے بھی شاید صرف اتنا کہا تھا۔

''Wow کیا بات ہے؟''

ایک عام شخص خوبصورت منظر کو دیکھ کر اتنا سا ہی اظہار کر پاتا ہے وہ اتنا تو کہہ سکتا ہے ''واہ! کیا بات ہے'' مگر ذخیرۂ الفاظ کے بغیر کسی منظر کو لفظوں میں بیان کرنا آسان نہیں۔ میں بھی چودہ برس پہلے اس قابل نہ تھا مگر اب کسی حد تک مجھے الفاظ بنتے آ گئے ہیں۔ اس لیے مہوڈنڈ جھیل کی جانب سفر اور اس رفاقت کو لفظوں میں بُن دیا۔ تو ہمیں ماہر جولاہا بننے میں ابھی بہت سفر باقی ہے۔

ممتاز شاعر، صحافی اور مزاح نگار گل نوخیز اختر سے عامر بن علی کی گفتگو

بقیہ انٹرویو

☆ اب تک آپ کی کون کون سی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں؟

NO خبریاں، آنکھیں غزل ہیں آپ کی، ڈونٹ وری، شرارتی، رائٹرز ڈائریکٹری، ٹائیں ٹائیں فش، چھارجی اور طلسمہ

☆ آپ نے اردو زبان میں پہلا مکمل مزاحیہ ناول تحریر کیا، کیسا تجربہ رہا؟

☆☆ یہ ایک انتہائی مشکل کام تھا، مجھے اکثر دوست کہتے تھے کہ تمہارا کالم پڑھ کر ہم ہنستے ہیں لیکن یہ ہنسی تھوڑی ہی دیر میں ختم ہو جاتی ہے کیونکہ کالم ختم ہو جاتا ہے۔ تب میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ ایک باقاعدہ مزاحیہ ناول تحریر کیا جائے۔ لیکن اس کے لیے ڈھیر سارا وقت درکار تھا۔ ایسے میں ایک دوست حسن علی نے تجویز پیش کی کہ آپ ہماری ویب سائٹ ''اردوستان'' پر یہ ناول قسطوں میں سٹارٹ کریں، یہ آئیڈیا مجھے اچھا لگا اور یوں تین سال کے عرصے میں تھوڑا تھوڑا کر کے یہ ناول مکمل ہو گیا۔ لیکن میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اسے اتنی پذیرائی ملے گی۔ آج بھی یہ ناول میری ویب سائٹ www.nokhaiz.com پر کتابوں کے سیکشن میں آن لائن موجود ہے اور احباب اسے انتہائی محبت سے پڑھتے ہیں اور اپنی مسکراہٹوں سے نوازتے رہتے ہیں۔

☆ لوگ کہتے ہیں کہ ناکام عشق آدمی کو شاعر بنا ڈالتا ہے، آپ کیا سمجھتے ہیں؟ آپ کی شاعری کی وجہ بھی تو کوئی ناکام رومانوی واردات نہیں؟

☆☆ رومانی وارداتیں تو میری زندگی میں بھری پڑی ہیں، لیکن کسی عشق نے مجھے شاعر نہیں بنایا بلکہ شاعری کے بعد مجھے عشق کا حوصلہ پیدا ہوا، میں سمجھتا ہوں ناکام عشق کے بعد انسان شاعر نہیں بندے کا پتر بن جاتا ہے، ناکام عشق کے بعد کی شاعری بھی اکثر ناکام ہی ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں ویسے بھی محبوب کی یاد میں تڑپنا اور سسکنا شاعر کا پسندیدہ موضوع ہے۔

☆ آپ کی ادبی و صحافتی زندگی ہمارے سامنے ہے، ایک کمٹمنٹ کے ساتھ آپ اس میدان میں آئے اور اپنے شوق کو کامیاب طریقے سے وسیلہ روزگار بنانے میں کامیاب رہے، اس شعبے میں نوواردان کے لیے کوئی مشورہ، پیغام دیں گے؟

☆☆ لکھنے لکھانے کو وسیلہ روزگار بنانا بہت مشکل اور کٹھن فیصلہ تھا، خصوصاً اُس دور میں جب شاعروں ادیبوں کے متعلق مشہور تھا کہ ان کے گھروں کے چولہے عموماً ٹھنڈے ہی رہتے ہیں۔ لیکن میرے پاس اور کوئی چوائس نہیں تھی۔ تین چار ملازمتیں کرنے کے بعد احساس ہو گیا تھا کہ عنقریب تخلیقی طور پر اپاہج ہو جاؤں گا۔ لہٰذا سب کچھ چھوڑ کر لکھنے لکھانے کا کام شروع کر دیا۔ ابتدائی طور پر یہ دن بہت کڑے تھے لیکن اب یہ حالت ہے کہ فل ٹائم صرف یہی کام کرتا ہوں۔ نئے آنے والوں سے یہی گذارش کروں گا کہ لکھنے سے زیادہ پڑھنے کو ترجیح دیں، اچھی چیز پڑھنے سے اچھی چیز لکھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں مطالعے کا رجحان بہت کم ہو گیا ہے جس کی وجہ سے لوگ پڑھتے کم اور لکھتے زیادہ جا رہے ہیں۔

☆ کہا جاتا ہے کہ ہم مزاح کے عہدِ یوسفی میں زندہ ہیں، کیا آپ بھی مشتاق یوسفی کو عہدِ حاضر کا سب سے بڑا مزاح نگار سمجھتے ہیں؟ مزاح نگاری میں کن لوگوں نے متاثر کیا؟

☆☆ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم مزاح کے عہد یوسفی میں زندہ ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ہم ''سلسلہ قاسمیہ'' کے پیروکار ہیں، میں مزاح میں عطاء الحق قاسمی صاحب کو اپنا پیر و مرشد مانتا ہوں، قاسمی صاحب کی محبت کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے رہتے ہیں اور خصوصاً مزاح نگاری کے حوالے سے تو یوسفی صاحب کے بعد قاسمی صاحب سے بڑا کوئی نام نہیں۔ ان کے بعد کے ناموں میں یونس بٹ صاحب نہایت اہم ہیں، اشفاق احمد ورک انتہائی چلبلا فقرہ چست کرتے ہیں، وقار احمد صاحب کا اپنا ایک منفرد انداز ہے، یاسر پیرزادہ بڑا شاندار لکھتے ہیں، حسین احمد شیرازی صاحب بڑا شستہ مزاح لکھتے ہیں، نئے مزاح نگاروں میں ناصر ملک صاحب انتہائی زندہ جملہ بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، علی رضا، حافظ مظفر محسن اور شوکت علی مظفر صاحب بہت اچھا لکھتے ہیں، ابرار ندیم صاحب اگرچہ مزاح کم لکھتے ہیں لیکن جس دن وہ اس میدان میں سنجیدہ ہوئے بہت شہرت پائیں گے

☆ کیا آج کا ادیب اپنی سماجی و معاشی ذمہ داری نبھا رہا ہے؟

☆☆ ادیب بیچارے نے کیا سماجی اور معاشی ذمہ داری نبھانی ہے، 99 فیصد ادیب اپنی معاشی ضروریات پوری کرنے کے لیے کسی نہ کسی غیر ادبی نوکری کے محتاج ہیں، سماجی طور پر وہ اپنی تحریروں سے بہت کچھ بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن معاشی طور پر ان کی بدحالی آج بھی قائم ہے۔ پرائیویٹ چینلز

آنے سے میرے جیسے کم تر ادیبوں کو کچھ معاشی استحکام ضرور ملا ہے لیکن جینوئن ادیب آج بھی روٹی روزی کے لیے پریشان ہے۔ شائد اس لیے بھی کہ ہمارے ہاں بیشتر ادیب کمرشل ازم کو سمجھنے سے قاصر ہیں، وہ کمرشل رائٹنگ کو گناہ سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ایک شاعر ادیب اگر جنرل سٹور کا مالک ہے تو وہ وہاں آنے والے گاہک کو شاعری یا افسانہ سنا کر ٹوتھ پیسٹ نہیں بیچتا...... کمرشل ازم بھی جنرل سٹور ہے، اسے جنرل سٹور کی طرح ہی ٹریٹ کرنا پڑتا ہے۔

☆ ادب میں ترقی پسند تحریک یا کسی بھی تحریک کو کیسے دیکھتے ہیں؟ اہل قلم کو سیاسی ہونا چاہیے؟

☆☆ یہ تحریکیں بہت پرانی ہو چکیں، اب کوئی شاعر ادیب نہ چاہنے کے باوجود بھی ترقی پسندی سے جان نہیں چھڑا سکتا، ہر دور اپنے زمانے کی بات مانگتا ہے، روایت سے پہلے بھی کوئی روایت دم توڑ چکی ہوتی ہے لہذا روایت ہمی نے بنانی ہوتی ہے۔ جہاں تک اہل قلم کے سیاسی ہونے کی بات ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، بلکہ ایک لحاظ سے یہ بہت ضروری بھی ہو جاتا ہے کیونکہ سیاست زمانہ حال سے تعلق رکھتی ہے اور زمانہ حال سے کٹ کر کوئی تخلیق اپنا مقام نہیں بنا سکتی۔

☆ موسیقی آپ کو بہت پسند ہے، کیسی موسیقی پسند ہے؟ کون سے گلوکار زیادہ پسند ہیں؟

☆☆ مجھے موسیقی سے عشق ہے، ہر قسم کی موسیقی سے لطف اندوز ہوتا ہوں، نصیبو لعل، شکیرا، مہدی حسن، عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی، محمد جمن، طفیل نیازی، ابرار الحق، عاطف اسلم، یو یو ہنی سنگھ، میکا سنگھ، ثریا گوشال، لتا، نور جہاں، رفیع صاحب، مکیش، کشور کمار...... سبھی کی آواز کا لطف لیتا ہوں۔

مزاحِ راہ

☆ علی رضا احمد کا شگفتہ و فکاہیہ مضامین پر مشتمل تیسرا مجموعہ

☆ بقول ضیاء الحق قاسمی کہ "علی رضا احمد کے سامنے ایک وسیع میدان پڑا ہے۔ ان کی شائع شدہ تحریریں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے مزاح نگار بن چکے ہیں۔

اعلیٰ امپورٹڈ کاغذ قیمت 300 روپے خوبصورت سرورق سے آراستہ

اُردو تحقیق صورتحال اور تقاضے

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل

پاکستان کے نامور سکالر ڈاکٹر معین الدین عقیل کی اُردو تحقیق کی موجودہ صورت حال اور اسے درپیش مسائل سے آگہی پر عمدہ کتاب، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ اور طالبات کی ضروریات کے لیے انتہائی ممد و معاون

قریباً 5 صد صفحات قیمت: 700 روپے

چولستان تاریخ و ثقافت

چولستان کی تاریخ و ثقافت کے حوالے سے اک اہم کتاب۔ اس خطے کے حکمرانوں، صوفیاء، اولیاء اللہ، فنکاروں، رسم و رواج، تاریخی عمارتوں سے روشناس کرایا گیا ایک مختصر مگر جامع کتاب۔

پروفیسر جاوید عثمان شامی کے قلم سے۔ قیمت 300 روپے

القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

ماں

احمد سبحانی آکاش/لاہور

میں تیری ہستی پہ کیسے لکھوں
قلم کی زد میں جو لفظ آئیں گے
کیا وہ تیری محبتوں کا شمار کرنے کے اہل ہوں گے؟
تری عطا کا حصار کرنے کی جستجو میں
مدد کریں گے؟
تری صدا کے تمام رنگوں کو
سن سکیں گے؟
تری نظر میں چمکتے جذبے کو
چن سکیں گے؟
تیرے خیالوں میں میرا بچپن جوان ہوتے
یہ کیسے دیکھیں؟
تری تمنا کو خواب بنتے
یہ کیسے دیکھیں؟
معاف کرنا!
معاف کرنا! میں تیرے بارے میں
کچھ نہ لکھ کر بھی مطمئن ہوں
مجھے خبر ہے
کہ اپنے بارے میں جس نے تیری مثال دی ہے
وہ میرا مالک
وہ میرا خالق، وہ دو جہاں کا بنانے والا
وہ کہہ رہا ہے
تمام رشتوں میں تیرا رشتہ
عظیم تر ہے
عظیم تر ہے

ہم اُٹھائیں گے ہنس کر ستم آپ کے
تم کسی دن کھواب ہیں ہم آپ کے
بے نوا ہوں بیاں میں کروں کس طرح
کوئی دیکھے تو جور و ستم آپ کے
دیکھی جاتی نہیں آنکھیں اشکوں بھری
کاش اپنا سکوں رنج و غم آپ کے
خار ہو جائیں گے خود بخود اک طرف
پھول پتوں میں گے بڑھ کر قدم آپ کے
دو جہاں ہار کے وہ ہے بیٹھا ہوا
یہ ہیں ساحل یہ سارے کرم آپ کے

ارشد نذیر ساحل/بارسلونا

تیری تصویر جلا کر میں بہت رویا ہوں
راکھ سینے سے لگا کر میں بہت رویا ہوں
اک یہی تھی جو مرے درد سنا کرتی تھی
گھر کی دیوار گرا کر میں بہت رویا ہوں
وہ مرے دکھ کی تلافی کے لیے آیا تھا
اس کو باتوں میں لگا کر میں بہت رویا ہوں
میں ترے سامنے کھل کر نہیں رویا لیکن
اشک آنکھوں میں چھپا کر میں بہت رویا ہوں
میں تو اک عشق کی تکمیل کا متقاضی تھا
خود کو اس سمت چلا کر میں بہت رویا ہوں
میرے چھونے پہ مجھے خواب میں جھٹکا تُو نے
نیند سے خود کو جگا کر میں بہت رویا ہوں
جس کی دہلیز پہ بچھڑا تھا وہ مجھ سے ثاقب
آج اس گھر کو سجا کر میں بہت رویا ہوں

ثاقب علی ساقی/بارسلونا

کہیں پہ ٹوٹا ستارا تو آنکھ بھر آئی
خیال آیا تمہارا تو آنکھ بھر آئی
محبتوں کے شب و روز یاد آنے لگا
کہیں ملا وہ دوبارہ تو آنکھ بھر آئی
تمہارے خواب مری ملکیت میں ہوتے تھے
ہوا کسی کا اجارہ تو آنکھ بھر آئی
تمہارے بعد کسی بھی خوشی کے موقعے پر
کبھی جو خود کو سنوارا تو آنکھ بھر آئی
گئے دنوں کے جھروکے سے یاد کر کے مجھے
کسی نے یونہی پکارا تو آنکھ بھر آئی
تمام عمر اکیلے گزار دی اور اب
کسی نے مجھ کو پکارا تو آنکھ بھر آئی
میں صائمہ کبھی لہروں، کبھی بھنور میں رہی
نظر جو آیا کنارا تو آنکھ بھر آئی

صائمہ ملک/بارسلونا

حسینؑ جیسا کوئی مہربان ہوتا ہے
سناں کی نوک پہ وہ ترجمان ہوتا ہے
زمانے والو میری بات یاد رکھنا تم
نبی ہمیشہ خدا کی زبان ہوتا ہے
مجھے بھی اذنِ شہادت عطا کریں مولا
یہ کربلا میں کھڑا ہر جوان ہوتا ہے
زمین کرب و بلا اس قدر بتائے مجھے
یہ کس کے سوگ میں اب آسمان ہوتا ہے
کہاں گئے ہیں مسافر وہ کربلا والے
کبھی کبھی میرے دل کا مکان ہوتا ہے
ہزار زخم اُبھرتے ہیں دل پہ اے محسن
حسینؑ کی جو کوئی داستان ہوتا ہے

محسن بھٹی/بارسلونا

عکس تیرا روبرو ہے آج بھی
مجھ کو تیری جستجو ہے آج بھی
وقت نے چہرے پہ جالے بُن دیے
دل اگرچہ خوبرو ہے آج بھی
میرے ہاتھوں کی لکیروں میں لکھی
آپ ہی کی آرزو ہے آج بھی
زندگی کی طرز پہلی سی نہیں
صوت لیکن ہُوبہو ہے آج بھی
تو نہیں ہے سامنے میرے مگر
تیری خوشبو چار سُو ہے آج بھی
دشت میں پیاسا جسے مارا گیا
اس کا چرچا کُو بہ کُو ہے آج بھی
ساری دُنیا دوستی کی راہ پر
وہ قمر اپنا عدو ہے آج بھی

نذیر اے قمر/میڈرڈ

ہمارے بیچ غضب کا مکالمہ ہوا تھا
پھر اس کے بعد یہ سوچا گیا کہ کیا ہوا تھا
نہ صرف تلخ بہت تھا وہ نیلگوں بھی تھا
مجھے تو شک ہے سمندر میں کچھ ملا ہوا تھا
وہ خط جو پڑھنے سے پہلے ہی میں نے پھاڑ دیا
اگرچہ نام تھا میرے مگر کھلا ہوا تھا
مجھے کہانی میں کردار کچھ ملا ایسا
تھے جس کے ہاتھ تو آزاد منہ بندھا ہوا تھا
اکیلی رہ گئی دونوں ہی مر گئے جن میں
میرے حصول کی خاطر مقابلہ ہوا تھا
ذرا قریب جو آیا اسے ڈبو دیں گے
سمندروں کا کسی سے معاہدہ ہوا تھا
چلو وہ دور رہے گا تو بھول جائے گا
ذرا سی دیر مجھے یہ مغالطہ ہوا تھا
جب اپنی قوتِ گویائی کھو چکی ہے نشاطؔ
تو کوئی اور بتا دے کہ اس کو کیا ہوا تھا

آصفہ نشاط

شام پھر سے ہی ڈھلتی جاتی ہے
شمع کوئی پگھلتی جاتی ہے
روشنی ہے کہ یہ دُعا ہے مری
پچھلی شب سے جو جلتی جاتی ہے
سانس کی لہر تجھ سے ہو ہو کر
دل کے رستے نکلتی جاتی ہے
پہنچے گی اب کہاں یہ خاک مری
یہ ہوا تیز چلتی جاتی ہے
ایک سپنا بکھرتا جاتا ہے
ایک خواہش مچلتی جاتی ہے
دیکھ کر رنگ انیلہؔ اُس کا نیا
میری رنگت بدلتی جاتی ہے

انیلہ بھلّر

تخریب میں تعمیر کے پہلو ہیں نہاں اور
مٹتا ہے جہاں ایک تو بنتا ہے جہاں اور
تھک جائیں گے اک روز تو خود ظلم کے بازو
جتنے بھی ستم ہوتے ہیں کہتے ہیں کہ ہاں اور
دیکھیں گے کہ لکھتا ہے گلستاں کا محرک
گل چیں کا بیاں اور ہے بلبل کا بیاں اور
ہمت کے مطابق ہے منازل کا تعین
دیپک کا جہاں اور پتنگے کا جہاں اور
اے مہرؔ مرے دل کی لگی رو کے بجھی ہے
چھینٹے جو دیے جاتے ہیں اُٹھتا ہے دُھواں اور

سلطان مہر (ڈاکٹر)

زندگی اور موت کا یوں رابطہ رہ جائے گا
مقتلوں کو جانے والا راستہ رہ جائے گا
خشک ہو جائیں گی آنکھیں اور چھٹ جائے گا ابر
زخم دل ویسے کا ویسا ہی ہرا رہ جائے گا
بجھ چکی ہوں گی تمہارے اپنے گھر کی مشعلیں
اور تو لوگوں میں شمعیں بانٹتا رہ جائے گا
ساتھ لے جائے گا اک اک چیز وہ جاتے ہوئے
لیکن اُس کا نام آنکھوں میں لکھا رہ جائے گا
پھول میں موجود رہنے سے ہے خوشبو کا وقار
پھول میں خوشبو نہیں ہوگی تو کیا رہ جائے گا
داستانِ عشق ایسی چھوڑ جاؤں گا سروشؔ
وقت حیرانی سے مجھ کو دیکھتا رہ جائے گا

شکیل سروش

آیا ہے کون کیوں یہ ہوا مشکبار ہے
موسم کا بھی مزاج بہت خوشگوار ہے
شبنم نے فرطِ شوق میں موتی لٹائے ہیں
لبریز گل کے ہاتھ میں جامِ بہار ہے
میٹھا سا ایک گیت ہے موجوں کے شور میں
دریا کے پار کس کو مرا انتظار ہے
سرگوشیوں میں عہد وفا کر رہے ہو کیوں
سو کہہ دیا نا میں نے مجھے اعتبار ہے
تاجوں پہ جس نے کوئی قصیدہ نہیں لکھا
تختِ سخن پہ آج وہی تاجدار ہے
موناؔ یقین کی نہیں ایماں کی بات ہے
آلِ رسولؐ پہ تو مری جاں نثار ہے

مونا شہاب

مسکراتی ہوئی دھنک ہے وہی
اس بدن میں چمک دمک ہے وہی
پھول مرجھا گئے اُجالوں کے
سانولی شام میں نمک ہے وہی
اب بھی چہرہ چراغ لگتا ہے
بجھ گیا ہے مگر چمک ہے وہی
وہ سراپا دیے کی لو جیسا
میں ہوا ہوں ادھر لپک ہے وہی
کوئی شیشہ ضرور ٹوٹا ہے
گنگناتی ہوئی کھنک ہے وہی
پیار کس کا ملا ہے مٹی میں
اس چنبیلی تلے مہک ہے وہی

بشیر بدر

بڑی گتھیاں ہیں بڑے مسئلے ہیں
کہیں کس سے ہم کس قدر مرحلے ہیں
کوئی دن کی باتیں ہیں کچھ اور سانسیں
بہت مختصر روح کے سلسلے ہیں
یہ سرسبزہ کوہ، وادیاں یہ سکوں کی
کہیں ان کے نیچے چھپے زلزلے ہیں
گلستاں ہی زد میں ہے بجلیوں کی
لیے چار تنکے کدھر ہم چلے ہیں
کڑی دھوپ گم گشتہ راہیں بے منزل
شکستہ پری ہے، بلند حوصلے ہیں

ترنم ریاض/سری نگر

ہم بندگاں تو نذرِ وفا ہونے والے ہیں
پھر آپ لوگ کس کے خدا ہونے والے ہیں
اس طرح مطمئن ہیں مرے شب گزیدگاں
جیسے یہ سائۂ ظلِ ہما ہونے والے ہیں
بے چارے چارہ سازیٔ آزار کیا کریں
دو ہاتھ ہیں سو محوِ دعا ہونے والے ہیں
اک روز آسماں کو بھی تھکنا ضرور ہے
کب تک زمیں پہ حشر بپا ہونے والے ہیں
ہم پہلے تشنگی کی حدوں سے گزر تو جائیں
سارے سراب آبِ بقا ہونے والے ہیں
لگتا نہیں ہے دل کو جفا کا کوئی جواز
نامہرباں، یہ تیر خطا ہونے والے ہیں

عرفان صدیقی

گلیاں ہیں بہت سی ابھی دیوار کے آگے
سنسار ملیں گے تجھے سنسار کے آگے
معنی کی نئی شرحیں تھیں ہر بات میں اس کی
اقرار سے پہلے بھی انکار کے آگے
تقدیر جسے کہتے ہیں دنیا کے مفکر
زردار کے پیچھے ہے تو نادار کے آگے
ان کو بھی سمجھنا ہے ابھی صاحب ادراک
ہوتے ہیں حقائق بھی تو اخبار کے آگے
کیا عزتِ سادات ذرا دیر نہ ٹھہری
دستار بھی پازیب کی جھنکار کے آگے
اب ہاتھ قلم ہوتے ہیں، کیا گزری ہو سوچو
جب بات گئی ہوگی یہ معمار کے آگے
محدود ہی ہوتی ہے سدا سطوتِ شمشیر
لاتا ہے قلم کو تری تلوار کے آگے

قیصر خالد/ممبئی

جانے والوں سے رابطہ رکھنا
دوستو رسمِ فاتحہ رکھنا
گھر کی تعمیر چاہے جیسی ہو
اس میں رونے کی کچھ جگہ رکھنا
مسجدیں ہیں نمازیوں کے لیے
اپنے گھر میں کہیں خدا رکھنا
جسم میں پھیلنے لگا ہے شہر اپنی
اپنی تنہائیاں بچا کر رکھنا
عمر کرنے کو ہے پچاس کو پار
کون ہے کس جگہ پتا رکھنا

ندا فاضلی

ممبئی کے معروف نوجوان شاعر
قیصر خالد کا پہلا شعری مجموعہ
شعورِ عصر
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہوگیا ہے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

سوال تجھ سے شب و روز میرا چلتا رہا
جواب تیرا ہواؤں میں مجھ کو ملتا رہا
فلک پہ چاند ستاروں کا کارواں بھی بجھا
تمہاری یاد کا لیکن چراغ جلتا رہا
قریبِ مرگ جو دیکھا تو پاس کوئی نہ تھا
تمام عمر یہ پھر کون ساتھ چلتا ہ رہا
بلا کے حبس میں ساری زمین سوکھ گئی
مگر یہ پیار کا پودا تھا پھر بھی پھلتا رہا
میں بےوفا بھی کہوں کس طرح تجھے جاناں؟
تو بن کے بادِ صبا روز مجھ سے ملتا رہا

اعجاز احمد اعجاز

ہمیشہ اُداس سہیلی رہی
اکیلی تھی میں اور اکیلی رہی
میں سادہ اسے بوجھ پاتی کہاں
مری زندگی تو پہیلی رہی
جو کانٹے تھے اُن کا تو افسوس کیا
کہ سانپوں کی زد میں چنبیلی رہی
فقط اوڑھ کر صبر کی اوڑھنی
میں طوفان کتنے ہی جھیلی رہی
رہی ہر خوشی سے ہمیشہ خفا
دُکھوں کی میں بچپن سے بیلی رہی
فقط رہ گئیں یادیں ہی سعدیہ
نہ بچپن رہا نہ حویلی رہی

سعدیہ سیٹھی

میں جاتا ہوں جہاں جہاں نوحہ ہے میرے ساتھ
محسوس ہو رہا ہے کہ کوفہ ہے میرے ساتھ
چہرہ مرا فسردہ سا جو آتا ہے نظر
یہ ہجر میں ملا تھا یہ ورثہ ہے میرے ساتھ
زنجیر پاؤں میں پڑی میرے ابھی ابھی
بچھڑا تھا میں جہاں یہ وہ رستہ ہے میرے ساتھ
چہرے سے خوں ٹپکتا ہے اب تک کمال ہے
یہ تیرے عشق کا ہی تو لاشہ ہے میرے ساتھ
پیشانی پر ہے نور کا نقشہ بنا ہوا
چوما تھا میرا ماتھا جو بوسہ ہے میرے ساتھ
بھوکا تھا پیٹ میرا یہ صدیوں سے وصل کا
عاصم وہ اب بھی صورتِ ناقہ میرے ساتھ

عاصم ندیم

صدیوں پہ ہے محیط سکونت کا واقعہ
مت پوچھ ایک پل کی طوالت کا واقعہ
ممکن نہیں ہے صبح ازل پھر اسے لکھے
جیسا تھا بزمِ شمع ہدایت کا واقعہ
ہم اہل عشق ہیں سو بڑے جلدباز تھے
عجلت میں ہم نے لکھا محبت کا واقعہ
وہ دل نواز چیخ مری گود میں گری
یہ کاکروچ کی ہے خباثت کا واقعہ
جا خانۂ اوراق پہ آواز دے کے دیکھ
مت پوچھ مجھ سے اُس کی عنایت کا واقعہ
پاؤں رکھا جہاں پہ وہیں پھول کھل اُٹھے
پھیلا ہے سارے دشت میں وحشت کا واقعہ
منصور اعتقاد ضروری سہی مگر
ہونا نہیں ہے کوئی قیامت کا واقعہ

منصور آفاق

لمس تشنہ لبی سے گزری ہے
رات کس جاں کنی سے گزری ہے
اس مرصع نگار خانے میں
آنکھ بے منظری سے گزری ہے
ایک سایہ سا پھڑپھڑاتا ہے
کوئی شے روشنی سے گزری ہے
لوٹنے والے ساتھ ساتھ رہے
زندگی سادگی سے گزری ہے
کچھ دکھائی نہیں دیا شاید
عمر اندھی گلی سے گزری ہے
شام آتی تھی دن گزرنے پر
کیا ہوا کیوں ابھی سے گزری ہے
کتنی ہنگامہ خیزیاں لے کر
اک صداف مشی سے گزری ہے
آنکھ بینائی کے تعاقب میں
کیسی لاحاصلی سے گزری ہے

یاسمین حبیب

عالمی شاعری / بحرین

ٹوٹ جائے گا ترا شیشے کا پیکر دیکھنا
وقت کے ہاتھوں میں ہیں نفرت کے پتھر دیکھنا
رُخ ہواؤں کے ازل سے وقت کے محتاج ہیں
گر یقیں ہم پر نہ ہو تو آزما کر دیکھنا
پاؤں تو پھیلا رہے ہو اے مرے شاعر مگر
اپنے حرفوں سے بنی شعروں کی چادر دیکھنا
چاندنی راتوں میں کیسے درد ہوتے ہیں جواں
جاننا چاہو اگر جا کر سمندر دیکھنا
جب دیارِ غیر میں نکلیں تلاشِ رزق میں
تو پرندوں کے ذرا جلتے ہوئے پر دیکھنا
دستِ عسرت پر لکیریں اے نجومی اب کہاں
دست کی ریکھاؤں میں میرا مقدر دیکھنا
ہم غریب شہر لوگوں کا ہے طارق مشغلہ
ساحلوں سے ڈوبتے سورج کا منظر دیکھنا

اقبال طارق

دور غربت اگر نہیں ہوتا
یوں بچھڑنے کا ڈر نہیں ہوتا
زندگی اتنی تلخ ہے اس پر
زہر کا بھی اثر نہیں ہوتا
بزدلی سے تو زندگی کا میاں
ایک لمحہ بسر نہیں ہوتا
میری منزل مجھے نہیں ملتی
غم اگر ہم سفر نہیں ہوتا

اس نئی نسل پر نصیحت کا
اک ذرا بھی اثر نہیں ہوتا
کوئی رُخسار ان کو بتلا دے
اب اکیلے سفر نہیں ہوتا

رُخسار ناظم آبادی

وہ حرف حرف کو حرفِ حساب کر دے گا
خموش رہ کے مجھے لاجواب کر دے گا
وہ آئے گا مری آنکھوں میں بارشیں لے کر
مری رُتوں کو سپردِ سحاب کر دے گا
کرن کرن وہ اُتر آئے گا دریچوں سے
نفس نفس وہ مجھے آفتاب کر دے گا
وہ بانٹ جائے گا ہر دل کو درد کی خوشبو
وہ ایک زخم ہنر کو گلاب کر دے گا
وہ قیس آئے گا تاریخِ دل رقم کرنے
محبتوں کو شریکِ نصاب کر دے گا

سعید قیس

نہ رات اپنی، نہ صبح تک انتظار اپنا
چمن جو چھوٹا رہا نہ پھر اختیار اپنا
میں مقتدی ہوں امام ہیں دو جہاں کے والی
ہوا ہے ان کے گداؤں میں بھی شمار اپنا
رہا ہے دل میں جو مدتوں تک کہاں گیا وہ
نگر نگر میں تو ڈھونڈتا ہوں وہ یار اپنا

میں منتظر ہوں تری مسیحائی کا ابھی تک
کبھی تو ٹوٹے گا دکھ کا ہے جو حصار اپنا
نیا زمانہ ہمارے لہجے کو کیسے سمجھے
ہے نفرتوں کا بدل محبت شعار اپنا
وطن سے دوری میں نانِ شب کے گدا نے دیکھا
یہاں میسر سکون اور نہ قرار اپنا
حدیں مٹیں گی تمام یکجا جو ہم ہوئے تو
رہو گے نہ تم مگر رہے گا شمار اپنا
کرن یہ سورج کی کہہ گئی مجھ سے جاتے جاتے
کہ ظلمتوں میں سنبھالے رکھنا وقار اپنا
ہماری تہذیب کے دریچے کھلے رہیں گے
تمہارے دل میں چھپا رہے گا یہ خار اپنا
یہ بت پرستی، صنم کدے ہوں تمہیں مبارک
ہے ذاتِ ربی پہ سارا دار و مدار اپنا
اُداس شاموں میں سسکیاں لیتے لوگ بولے
کہ اپنے گھر میں ہوا ہے مبہم قرار اپنا
نظر لگائی کسی نے میرے نگر کو شاہد
کہ ظلمتوں نے کیا ہے اس پر بھی وار اپنا

محمد ریاض شاہد

بحرین میں مقیم معروف شاعر
اقبال طارق کے شعری مجموعوں سے انتخاب
جلد منظرِ عام پر آ رہا ہے
جسے معروف شاعر اور پی ٹی وی میں کرنٹ
افیئرز کے پروڈیوسر علی رضا نے مرتب کیا ہے

کوئی جائے اماں نہیں ہوتی
ماں اگر مہرباں نہیں ہوتی
یہ وہ رشتہ ہے جس کی نسبت سے
زندگی بے نشاں نہیں ہوتی
بے سہارا وہ لوگ ہوتے ہیں
جن کی دنیا میں ماں نہیں ہوتی
اپنی اولاد سے کسی پل بھی
ماں کبھی بدگماں نہیں ہوتی
سارے ہوتے ہیں اس بھرے گھر میں
ایک تو درمیاں نہیں ہوتی
وہ جو ہوتی تھی تیرے ہونے سے
اب وہ رونق یہاں نہیں ہوتی
یاد آتی ہے جب بھی ماں اسلم
دل کی دھڑکن رواں نہیں ہوتی

اسلم گمان

تشنگی کا حجاب بیچتے ہیں
اہل ثروت سراب بیچتے ہیں
حسن تعبیر آپ کے ذمے
ہم مسرت کے خواب بیچتے ہیں
چاند تسخیر کرنے والے اب
دھوپ کیا آفتاب بیچتے ہیں
بحری قزاق راہبر بن کر
میرے جہلم چناب بیچتے ہیں
جو طہورا کا روپ لے گی
ہم وہ اصلی شراب بیچتے ہیں

حنیف ترین

خواب تھے مرے جواں کل کی بات اور تھی
فصل گل تھی مہرباں کل کی بات اور تھی
دور وہ بھی تھا کہ جب ہر گماں یقین تھا
اب یقین بھی گماں کل کی بات اور تھی
خوش خرامیٔ غزل جس کو دیکھ دیکھ کر
تھک گیا تھا آسماں کل کی بات اور تھی
آج گرد سے اٹی دل کی شاہراہ ہے
ہر طرف ہے اب دھواں کل کی بات اور تھی
صورتوں میں آئینے، آئینوں میں صورتیں
تھی ہر ایک شے عیاں کل کی بات اور تھی
حدت لہو بھی تھی شوق تھے جنون کے
کیا بہار کیا خزاں کل کی بات اور بھی

سہیل ثاقب

بدنما چہرے پہ رقصاں قہقہہ ٹوٹا نہیں
یہ تماشا دیکھ کر بھی آئینہ ٹوٹا نہیں
چار سو بکھری پڑی ہیں دھجیاں دستور کی
حکمراں تو کہہ رہا ہے ضابطہ ٹوٹا نہیں
تو نے میرے حوصلے کو آزمایا بارہا
جوش قائم ہے ابھی تک ولولہ ٹوٹا نہیں
ہو گئے ہیں آج کیوں سارے لکیروں کے فقیر
سوچ کو جکڑا ہوا اک دائرہ ٹوٹا نہیں
دو دہائیوں سے پڑا ہوں میں دیارِ غیر میں
آج بھی گاؤں سے میرا رابطہ ٹوٹا نہیں
میری عظمت کے نشاں قائم رہیں گے جابجا
دیکھ جا کر اب بھی شہر قرطبہ ٹوٹا نہیں
آج بھی لفظوں کو صابرؔ سوچتا ہے رات دن
حرف و معنی کا حسیں تر سلسلہ ٹوٹا نہیں

محمد ایوب صابرؔ

یوں بزم میں سخن پہ ہے تالا پڑا ہوا
جیسے ہر اک زباں پہ ہو چھالا پڑا ہوا
آنکھیں بجھی ہوئی ہیں مگر دل ہے نور بار
ہر اک چراغ میں ہے اُجالا پڑا ہوا
قسمت میں اپنی موسم ہجرت ہے ان دنوں
کیا کیا ہے دھوپ میں گل لالہ پڑا ہوا
ہر آنکھ کو پتہ ہے کہ رونا ہے کس طرح
ہر شخص کو غموں سے ہے پالا پڑا ہوا
سنگ سفید ہوں مرے ظاہر پہ تم نہ جاؤ
آدم کے لمس سے ہوں میں کالا پڑا ہوا
مختارؔ کاروبارِ سخن کیا کرے کوئی
بازارِ شوق ہے تہہ و بالا پڑا ہوا

مختار علی

کسی کو راج دُلارے فریب دیتے رہے
کسی کو جان سے پیارے فریب دیتے رہے
یقین ملتا رہا تھرتھراتے ہونٹوں سے
مگر نظر کے اشارے فریب دیتے رہے
تمام رات میں چلتا رہا ہوں کانٹوں پر
تمام رات ستارے فریب دیتے رہے
کنول کھلا تھا محبت کا جس کے پانی پر
وہ جھیل، اس کے کنارے فریب دیتے رہے
سراب بنتا گیا پل میں ہر حسین منظر
مجھے تو سارے نظارے فریب دیتے رہے
وفا نہ کرتا اگر اک حسیں تو بات بھی تھی
اسدؔ کو سارے کے سارے فریب دیتے رہے

اسد رضوی

غموں میں ڈھال گیا لوٹ کر نہیں آیا
جو پچھلے سال گیا لوٹ کر نہیں آیا
بچھڑ گیا ہے وہ خوشیاں سمیٹ کر اور غم
مجھے سنبھال گیا لوٹ کر نہیں آیا
عجب طلسم ہے اس کی حسین آنکھوں میں
ادھر خیال گیا لوٹ کر نہیں آیا
میں خود بھی سوچ میں گم ہوں کہ تیرے آنے سے
کدھر ملال گیا لوٹ کر نہیں آیا
عجیب شخص تھا کھینچ کر صلیب وقت پہ وہ
ہمیں اُجال گیا لوٹ کر نہیں آیا
کٹا وہ شہر سے، پھر جب تری گلی سے کٹا
شکستہ حال گیا لوٹ کر نہیں آیا
ستم ظریف رواجوں کی اوٹ میں ایازؔ
مرا ہلال گیا لوٹ کر نہیں آیا

ایاز محمود ایاز

لگتا ہے ربط ہی نہیں صبحوں کے ساتھ ساتھ
شاموں میں ڈھل گئی ہوں، میں شاموں کے ساتھ ساتھ
اب اس سے بڑھ کے سانحہ ہونا ہے اور کیا
آنکھیں بھی جل بجھیں مری خوابوں کے ساتھ ساتھ
جھولی میں بھر کے چاند کی کرنیں تری طرف
چلتی رہی ہوں رات میں تاروں کے ساتھ ساتھ
جاناں! تمہاری یاد کے موسم ہرے بھرے
رہتے ہیں ہر گھڑی مری سانسوں کے ساتھ ساتھ
دیکھا ہے اُس نے مجھ کو زمانے کی آنکھ سے
اُس نے جفا بھی کی ہے وفاؤں کے ساتھ ساتھ
مجھ پر بھی ہو نزول اُجالوں کا اے سمنؔ
خواہش یہ جاگ اُٹھی ہے راتوں کے ساتھ ساتھ

سمن شاہ

چھین کر خواب مرے میری طلب پوچھتے ہیں
رات بھر نیند نہ آنے کا سبب پوچھتے ہیں
بارشیں آنکھ کی معیوب نہ ہوتی ہوں کہیں
عشق کا چل کسی اُجڑے سے ادب پوچھتے ہیں
تیرہ راتوں میں بھلا کیسے جیا کرتا ہے
میرے قاتل بھی تو اب مجھ سے یہ ڈھب پوچھتے ہیں
اپنے شجرے کو بھی ہمراہ لیے چل رسماً
جنگ سے قبل یہاں نام و نسب پوچھتے ہیں
چارہ سازوں نے تو اب سمت بدل لی عامرؔ
آؤ بازار میں بکتے ہوئے لب پوچھتے ہیں

محمود عامر

اُجلے اُجلے سے خیالوں کی طرح ہوتا ہے
پیار، شفاف اُجالوں کی طرح ہوتا ہے
کوئی لمحہ تو گزر جاتا ہے اک لمحے میں
کوئی لمحہ کئی سالوں کی طرح ہوتا ہے
سوچ کر اس پہ نکلنا کہ محبت کا سفر
اُلجھے اُلجھے سے سوالوں کی طرح ہوتا ہے
سوچتا ہوں یہ خوشی ہے کہ یہ غم ہے کیا ہے
چاند کے گرد جو ہالوں کی طرح ہوتا ہے
اُس کی ہر بات میں وسعت ہے سمندر جیسی
اُس کا ہر لفظ مثالوں کی طرح ہوتا ہے
چوم لیتا ہوں عقیدت سے میں بڑھ کر اُس کی
رنگ جو آپ کے گالوں کی طرح ہوتا ہے
دل اُسی شخص کو دے دیتے ہو تم کیوں اعظمؔ
جو کہ دل توڑنے والوں کی طرح ہوتا ہے

کامران اقبال اعظم

انہیں پھر پھول کہہ لو یا شرارے بانٹ آیا ہوں
مرے دامن میں جتنے تھے ستارے بانٹ آیا ہوں
مجھے کچھ لوگ کہتے تھے حساب ان کا چکا دوں میں
گئے موسم کے جتنے تھے شمارے بانٹ آیا ہوں
پھر اس کے بعد اے صاحب! مجھے کچھ دیکھنا کب تھا
نظر بھی دان کر دی ہے نظارے بانٹ آیا ہوں
مجھے معلوم جو ہوتا تو میں منصف نہیں بنتا
زمیں کیا بانٹ دی میں نے وہ پیارے بانٹ آیا ہوں
بھنور کی ہو گئی عادت، عجب تھا حوصلہ میرا
کہ دریا پاس رکھا اور کنارے بانٹ آیا ہوں
ضرورت تھی انہیں سیماب مجھ سے بھی کہیں بڑھ کر
عدو کے قافلے میں سب سہارے بانٹ آیا ہوں

بدر سیماب

اگر ہو جیب خالی بھی تو یہ دھنوان ہوتے ہیں
کہ اہل دل تو اپنی آپ ہی پہچان ہوتے ہیں
یہ جینا بھی کوئی جینا ہے ہم پردیس والوں کا
کہ اپنے گھر بھی جائیں تو فقط مہمان ہوتے ہیں
مجھے یوں مت کہا کیجیے کہ تیرے درد بانٹوں گا
کہ کچھ کلمات کہنے میں بہت آسان ہوتے ہیں
محبت ہے کہ نفرت ہے، مسلط مجھ پہ مت کیجیے
تسلط کے طریقے کچھ وبالِ جان ہوتے ہیں
اگر یہ ٹھان لیں تو پھر وہی کرتے ہیں روز و شب
جو سچ پوچھو تو اہل دل بڑے نادان ہوتے ہیں
وفا کے راستوں پر ساتھ کب دیتا کوئی صفدؔر
حقیقت ہے کہ یہ رستے بہت ویران ہوتے ہیں

صفدر علی صفدر

وقت کی رفتار کا شکوہ عبث
اپنے پیروں پر تو چل کر دیکھیے
کیوں بکھر کر رہ گئی انسانیت
غور سے اپنے بھی اندر دیکھیے
روشنی سورج کی چومے گی قدم
پردۂ شب تو اُلٹ کر دیکھیے
گردشِ دنیا کا شکوہ ہے فضول
اپنی ہستی کا بھی منظر دیکھیے
دو کناروں کی ہوس کو چھوڑیے
اک کنارے پر اُتر کر دیکھیے
عشق کا ادراک ہو فیاض تب
یاں ملے سر جب تو پتھر دیکھیے

فیاض وردگ

جب ترے غم سے گزارے آنسو
بن گئے سارے ستارے آنسو
ایسے مانوس ہوئے غم سے تیرے
ہم کو رُلائیں ہمارے آنسو
اس جگہ کون تسلی دے گا
رائگاں جائیں گے سارے آنسو
منظر ہجر حسیں لگتا ہے
رنگ جب بھرتے ہیں کھارے آنسو
یوں چھلکنے لگی چشم گریہ
جانے والوں کو پکارے آنسو
عشق ناکام ہوا تو خالدؔ
اور لگنے لگے پیارے آنسو

خالد سجاد

ایک جیسا ڈر

اُس کی ہر بات
ذو معنی ہوتی ہے
شاید اسے
تعلق ٹوٹ جانے کا ڈر ہو
کبھی کبھی سوچتا ہوں
میں ہی اُس سے
صاف صاف کہہ دوں
مگر ڈرتا ہوں
تعلق ہی نہ ٹوٹ جائے کہیں

عیسیٰ بلوچ

شوق کی حد سے گزر کر دیکھیے
اپنا سر نیزے کے اُوپر دیکھیے

لڑنا بھی جو چاہیں تو میں لڑنے نہیں دیتی
میں ماں ہوں جو بچوں کو جھگڑنے نہیں دیتی
منظر ہو جدائی کا تو دیکھا نہیں جاتا
آباد گھروں کو میں اُجڑنے نہیں دیتی
پھولوں کی طرح پھینکتے ہیں بچے مسل کے
اُڑتی ہوئی تتلی میں پکڑنے نہیں دیتی
عادت ہے مری سینچتی ہوں اپنے لہو سے
سچائی کے پودے کو اُکھڑنے نہیں دیتی
زیبؔا میں محبت کی علامت کی طرح ہوں
آپس میں کسی کو میں جھگڑنے نہیں دیتی

مسرت جبیں زیبا

دیکھوں جو آسماں سے تو اتنی بڑی زمیں
اتنی بڑی زمین پہ چھوٹا سا اک شہر
چھوٹے سے ایک شہر میں، سڑکوں کا ایک جال
سڑکوں کے جال میں چھپی، ویران سی گلی
ویراں گلی کے موڑ پہ، تنہا سا اک شجر
تنہا شجر کے سائے میں، چھوٹا سا اک مکاں
چھوٹے سے اک مکان میں، کچی زمیں کا صحن
کچی زمیں کے صحن میں، کھلتا ہوا گلاب
کھلتے ہوئے گلاب ہو مہکا ہوا بدن
مہکے ہوئے بدن میں سمندر سا ایک دل
اس دل کی وسعتوں میں کہیں کھو گیا ہوں میں
یوں ہے کہ اس زمیں سے بڑا ہو گیا ہوں میں

اشفاق حسین

خمارِ شب میں زمیں کا چہرہ نکھر رہا تھا
کوئی ستاروں کی پالکی میں اُتر رہا تھا
نہا رہے تھے شجر کسی جھیل کے کنارے
فلک کے تختے پہ چاند بیٹھا سنور رہا تھا
ہوائیں دیوار و در کے پیچھے سے جھانکتی تھیں
دھواں لپیٹے کوئی گلی سے گزر رہا تھا
کھڑا تھا میری گلی سے باہر جہان سارا
میں خواب میں اپنے آپ سے بات کر رہا تھا
ہوا کا جھونکا اُداس کر کے چلا گیا ہے
ابھی ابھی تو میں جامِ غفلت کو بھر رہا تھا
اور اب ٹھہر جا نوید آگے تو کچھ نہیں ہے
تو عمر بھر اس خیال سے بے خبر رہا تھا

افضال نوید

تم سے ملنے کا وقت......

تم سے ملنے کا وقت
اسی جنم میں مقرر تھا
تو پھر کیوں ڈھونڈا تمہیں
ہر جگہ...... ہر لمحہ
رُخِ ماہتاب پر پھیلی
متوالی گھنگھور گھٹاؤں میں
آفتاب کے سنہری رتھ کی
جھلملاتی شعاؤں میں
تاروں کے کاسے میں مہکتی
صباؤں میں
سیاروں کے بازوؤں میں سمٹی
شرمیلی حسین صداؤں میں
سینۂ بحر میں دفن
سینکڑوں مقدس دُعاؤں میں
تم سے ملنے کا وقت
اسی جنم میں مقرر تھا
تو پھر کیوں......

تن دیپ تمنا

برف کے سمندر پر

برف کے سمندر پر
ایک لمحہ ٹھہرا تھا
خواب کی حقیقت کیا
جم گئے تھے آنسو بھی
حرف لوٹ آئے تھے
تیر، برف کی صورت
دل میں جا کے اُترے تھے
چاندنی کی چادر پر
کس قدر اندھیرا تھا
اور لہو کے سب قطرے
رُک گئے تھے پلکوں پر
کیا عجیب دھوکا تھا
روشنی کی چادر نے
سب کو ڈھانپ رکھا تھا
بے حسی تھی چہروں پر
کس نے کس کو دیکھا تھا
اور کس کو چاہا تھا
نور کے اُجالے میں
تیرگی کے سائے تھے
جل رہی تھی میں تنہا
کون میرا اپنا تھا
سب تھے منجمد ہر سو
برف کے سمندر پر

ردا فاطمہ

ایک دریا ہوں، روانی کے لیے آیا ہوں
یعنی آشفتہ بیانی کے لیے آیا ہوں
تیری محفل سے مجھے کچھ نہیں لینا دینا
میں تو بس یاد دہانی کے لیے آیا ہوں
اپنے ہونٹوں سے ادا کر کہ میں زندہ ہو جاؤں
لفظ ہوں اور معانی کے لیے آیا ہوں
لاشۂ دل پہ بھی برسائے گئے سیکڑوں تیر
سو یہاں مرثیہ خوانی کے لیے آیا ہوں
سرِ دریا میں جو پہنچا ہوں یہ مشکیزہ لیے
تم سمجھتے ہو کہ پانی کے لیے آیا ہوں
داستاں ختم ہوئی کیا مرا کردار اُٹھا
سو دوبارہ میں کہانی کے لیے آیا ہوں
میرؔ و غالبؔ ہی کے بعد آنا تھا فرتاش، سو میں
حفظِ ترتیب زمانی کے لیے آیا ہوں

فرتاش سیّد

شہزادوں سے عداوت نہیں کرتا کوئی
بدنصیبوں کی حمایت نہیں کرتا کوئی
مانگتے سب ہیں امیری کی دُعائیں دن رات
ہاتھ پیروں سے مشقت نہیں کرتا کوئی
کوچ کرتے ہوئے کہتے ہیں پرندے سب سے
ریگزاروں میں سکونت نہیں کرتا کوئی
فکر کرتے ہیں سبھی اہلِ جہاں کی لیکن
اپنے بچوں کو نصیحت نہیں کرتا کوئی
غیر کے واسطے کچھ مال بچے تو کیسے
اپنے خرچے میں کفایت نہیں کرتا کوئی
دہر میں نازؔ ہوئے ایسے معالج بدنام
دردِ دل کی بھی شکایت نہیں کرتا کوئی

شوکت علی ناز

یہ کیسا سفر ہے جو ٹھہرنے لگا مجھ میں
یہ دشت ہے کیسا جو گزرنے لگا مجھ میں
یہ کون بلانے لگا مجھ کو میری جانب
یہ کون سرِ شام اُترنے لگا مجھ میں
سمٹی ہوئی اک رات بکھرنے لگی ہر سُو
کھویا ہوا اک چاند اُبھرنے لگا مجھ میں
اک گم شدہ آواز نے آواز دی مجھ کو
اک نشہ کمیاب اُترنے لگا مجھ میں
پھر میں نے نبیلؔ آخر تلوار نکالی
پھر جنگ کا میدان سنورنے لگا مجھ میں

عزیز نبیل

تم سے مل کر یہ ہم نے جانا ہے
تم سے ناتا کوئی پرانا ہے
دور دنیا سے خود کو کر لیں گے
تم کو اپنے قریب لانا ہے
میں فلک تک چلوں گی سنگ ترے
تجھ کو بس اک قدم بڑھانا ہے
تیرا ملنا بڑا ہی مشکل ہے
خواب لیکن بڑا سہانا ہے
یہ تو طے ہے کہ مجھ کو رونا تھا
تیرا ملنا تو اک بہانہ ہے
یہ جو میرا غرور ہے اس کو
تیری بانہوں میں ٹوٹ جانا ہے
جن سے چہرے گلاب ہوتے ہیں
ان بہاروں کو پھر سے لانا ہے
کیوں یہ فرزانہؔ بات سمجھی نہیں
کون رکتا ہے جس کو جانا ہے

فرزانہ صفدر

جیسا نظر آتا ہوں حقیقت میں نہیں ہوں
لگتا ہوں مگر اتنی اذیت میں نہیں ہوں
چڑھ آئے ہیں کچھ رنگ بھی بے راہ روی کے
روشن ہوں مگر پوری ہدایت میں نہیں ہوں
پڑھ لوں گا بس اک رات میں برسوں کی نمازیں
سونے دو ابھی ذوقِ ریاضت میں نہیں ہوں
کرتا ہوں شب و روز محبت کے وظیفے
وعظ یہ سمجھتا ہے عبادت میں نہیں ہوں
دستور وفاداری کے آتے ہیں نبھانے
میں عہد فراموش جماعت میں نہیں ہوں
لگتا ہے کہ خود کو بھی کبھی پا نہ سکوں گا
افسوس کہ میں اپنی بھی قسمت میں نہیں ہوں

قیصر مسعود

عالمی شاعری/عمان

ایک ہی وار میں گرانے کو
لوگ نکلے مجھے منانے کو
چھوڑ کر کیوں چلے گئے ہو تم
عمر باقی تھی جب بتانے کو
اجنبی کی طرح وہ بیٹھے ہیں
دل لگا ہے مجھے رُلانے کو
خشک پتے بکھر گئے ایسے
بس ترستے رہے ٹھکانے کو
لوگ تو رونقوں پہ مرتے ہیں
میں کہ ڈھونڈوں اُجاڑ خانے کو
شہر کو چھوڑتا نہیں ماتم
جانے کیا ہو گیا زمانے کو
زندگی ہو گئی ہے رنج آلود
سب ترستے ہیں مسکرانے کو
روٹھ جاؤں اگر میں اُس سے قمر
آئے گا کیا مجھے منانے کو

قمر ریاض/مسقط

مجھ کو ویسے گماں گزرتا ہے
وہ ادھر سے کہاں گزرتا ہے
ہجر کا ہو یا وصل کا موسم
مجھ سے تو رائیگاں گزرتا ہے
ایک دریا گزرتا ہے ظاہر
ایک اُس کے نہاں گزرتا ہے

چاندنی رات میں نجانے کیوں
میرے گھر سے دھواں گزرتا ہے
میری آنکھوں سے خواب کا شب بھر
قافلہ بے اماں گزرتا ہے
جب بھی ملتا ہوں خود سے میں ناصر
کون یہ درمیاں گزرتا ہے

ناصر معروف/مسقط

لفظ معنی نہیں پائیں گے تو مر جائیں گے
یہ کہانی نہ سنائیں گے تو مر جائیں گے
اب کے احباب کے ہاتھوں سے ڈسے ہیں صاحب
اب کے پینے نہیں پائیں گے تو مر جائیں گے
دیکھئے دیکھئے مہتاب کو صورت میری
یہ جوانی نہیں پائیں گے تو مر جائیں گے
اب کوئی بات بھی اس کی نہ سنی جائے گی
دل کے اب طعنے اُٹھائیں گے تو مر جائیں گے
بادشاہوں کو تو مسند سے اُترنا ہو گا
ورنہ اب حشر اُٹھائیں گے تو مر جائیں گے
اب کے کردار پہ باندھا ہے نشانہ اُس نے
اب کے مقتل نہ سجائیں گے تو مر جائیں گے
میں صدف ہوں کسی دریا میں اُتر جاؤں گی
وہ مجھے چھوڑ کے پچھتائیں گے تو مر جائیں گے

صدف زبیری/مسقط

خوشی کیا ہے؟

خوشی کیا ہے کہ کچھ احساس میں لپٹے ہوئے لمحے
کسی انجان سی سوچوں کی بکھری وادیوں میں ہے
کبھی دل میں دبی معصوم سی یہ خواہشوں میں ہے
کبھی بچپن کے بچھڑے دوستوں اور ساتھیوں میں ہے
کبھی یہ چاند پر بیٹھی ہوئی بڑھیا کے قصوں میں
کبھی ابا کے شفقت سے بھرے لہجے کی گرمی میں
کبھی ماں کی دعاؤں کی بدولت راحتوں میں ہے
کبھی گھر کی کیاری میں بھرے کھلتے گلابوں میں
کبھی چنبہ چنبیلی سے پروتی جھالروں میں ہے
کبھی بہنوں کے سنگ تکرار گہنوں کی رسائی پر
کبھی بھیا کے سنگ بازار بھر کی گردشوں میں ہے
کبھی جیون میں اپنے ہم سفر کے عہد و پیماں میں
کبھی اس پاک بندھن سے جڑی سب چاہتوں میں ہے
کبھی کلکاریاں سی گونجتی مہکی فضاؤں میں
کبھی ان ننھے قدموں کی بدولت طاقتوں میں ہے
کبھی انجان ذہنوں میں گزرتی ساعتوں میں ہے
کبھی فرقت سے حاصل ہونے والی قربتوں میں ہے
ہزاروں قمقموں کی روشنی راہوں میں ہے عذرا
ہے صد ہا شکر رب کا بس اُسی کی رحمتوں سے ہے

عذرا علیم/مسقط

بزمِ جہانِ شوق کا محور بھی میں ہی تھا
اوراقِ دل پہ حرفِ مکرر بھی میں ہی تھا
جتنے بھی عکس تھے مرے اطراف میرے تھے
اندر بھی آئینے کے میں، باہر بھی میں ہی تھا
برسوں سے جس پہ کوئی بھی دستک نہیں ہوئی
اس شہرِ بے چراغ میں وہ در بھی میں ہی تھا
میں نے بھی اس کے حُسن کو بخشی تھی دلکشی
اس پیکرِ جمال کا مظہر بھی میں ہی تھا
الزام نامرادیٔ منزل میں کس کو دوں
خود اپنی راہ گزار کا پتھر بھی میں ہی تھا
دیکھا تو دور تک مرا ہم سفر نہ تھا کوئی
سوچا تھا اپنے قد کے برابر بھی میں ہی تھا
بزمِ سخن کی رونقیں سب میرے دم سے تھیں
شہرِ سخنوراں میں سخن ور بھی میں ہی تھا

سحر تاب رومانی/دبئی

گردِ سُود و زیاں ہے یا نہیں
یہ متاعِ جسم و جاں ہے یا نہیں
دُھند کے اس پار کچھ دکھتا ہے کیا
یہ خلاء یہ کہکشاں ہے یا نہیں
خوشبوؤں کی آگ سے اُٹھتا ہوا
یہ سلگتا سا دھواں ہے یا نہیں
دور سے دیکھا ہے تیرے شہر کو
جو بھی دیکھا ہے وہاں ہے یا نہیں
یہ فقط نظروں کا دھوکا ہی نہ ہو
یہ زمیں یہ آسماں ہے یا نہیں
میں اگر فرضی کوئی کردار ہوں
پھر یہ ساری داستاں ہے یا نہیں
یہ بھی یاروں کی شرارت ہی نہ ہو
یہ گروہ دُشمناں ہے یا نہیں
چھوڑ دے فرہاد ساری بحث کو
یہ بتا بس تو یہاں ہے یا نہیں

فرہاد جبریل/ابوظہبی

یہ اسیری تو کبھی لکھی نہ تھی تقدیر میں
پاؤں خود ہی ڈال کر بیٹھا ہوں میں زنجیر میں
یوں در و دیوار شہرِ دل کے ہیں توڑے گئے
عمر گزری ہے فقط اس شہر کی تعمیر میں
بس یہی سن کر چلے آئے ترے مقتل میں ہم
روشنی قوسِ قزح کی ہے تری شمشیر میں
زندگی کے سائے میں پلتے گمانوں کے سوا
کچھ نہیں پایا کسی بھی خواب کی تعبیر میں
میں کئی رنگوں سے بھی اُس کو مٹا پایا نہیں
نقش ہے اُس کی انا کا عکس جو تصویر میں
ایک اک کر کے مرے سب یار بھی چلتے بنے
جب ترا غم رہ گیا باقی مری جاگیر میں
میں غزل آراستہ کرتا ہوں تیرے ذکر سے
لڑکھڑاتا ہے قلم جب بھی مری تحریر میں
خودکشی کیا ہے کہ ہم تو روز مرتے ہیں صنم
ہم نے ڈالا بھی نہیں پھندا کبھی شہتیر میں

حیات جاوید/ابوظہبی

محفل کرب سجانے کو بچا کچھ بھی نہیں
آنکھ سے دریا بہانے کو بچا کچھ بھی نہیں
تیرے آ جانے سے تنہائی بھی اس گھر سے گئی
اب یہاں شور مچانے کو بچا کچھ بھی نہیں
ایک اُمید سر شام جلا لی میں نے
مجھ میں اب اور جلانے کو بچا کچھ بھی نہیں
دشت میں شہر بسا دیکھ کے اس دل نے کہا
اب یہاں خاک اُڑانے کو بچا کچھ بھی نہیں
یہی بہتر ہے قرینے سے جدا ہو جائیں
جب تعلق ہی بچانے کو بچا کچھ بھی نہیں

آصف رشید اسجد/ابوظہبی

اُسے دل سے بھلانا پڑ گیا ہے
دیا کوئی بجھانا پڑ گیا ہے
سنانے آئے اپنی بات لیکن
ترا قصہ سنانا پڑ گیا ہے
فلک کو برتری پانے کی خاطر
زمیں کو آزمانا پڑ گیا ہے
میں تم سے رُوٹھ کر دل سے ملی ہوں
مگر دل کو منانا پڑ گیا ہے
ترا پردے میں رہنا لازمی تھا
ہمیں پردے پہ آنا پڑ گیا ہے
کیا کیا جرم تو نے اے محبت
ترے پیچھے زمانہ پڑ گیا ہے
تمہارے واسطے اس زندگی سے
مجھے رشتہ نبھانا پڑ گیا ہے
کبھی ایسا نہیں چاہا تھا لیکن
تمہارے دل سے جانا پڑ گیا ہے
رُلایا دیر تک دوری نے نیناں
مگر پھر مسکرانا پڑ گیا ہے

نیر نیناں/ابوظہبی

اپنا تھا یا کہ پرایا نہیں گیا
اس دل میں ایک بار جو آیا نہیں گیا
چاہا تھا اشک روک لیں پلکوں پہ تھوڑی دیر
لیکن یہ بوجھ ہم سے اٹھایا نہیں گیا
تسخیر کائنات کی کوشش تو کی مگر
ہم سے سراغ اپنا بھی پایا نہیں گیا
ترکِ تعلقات کا الزام اُسی پہ کیوں
ہم سے بھی اس کا ساتھ نبھایا نہیں گیا
کہنے کو مہر و ماہ بھی تھے پھول بھی مگر
کچھ بھی تری مثال کو لایا نہیں گیا
افسوس ہے تو یہ کہ سرِ رہگزارِ زیست
ہم سے کوئی چراغ جلایا نہیں گیا

ارشد شاہین

تنہا ہر ایک راہ سے گزر جانا چاہیے
جیسے جیے ہیں ویسے ہی مر جانا چاہیے
جانے یہ دل کا درد کہاں تک ستائے گا
دریا چڑھے تو اس کو اُتر جانا چاہیے
بجھ کر وجود شعلہ سلگتا ہے کس لیے
میں راکھ ہوں تو مجھ کو بکھر جانا چاہیے
آوارگی میں کب سے گزرتی ہے رات بھی
آخر کبھی تو شام کو گھر جانا چاہیے
اے دوستو! کھڑے ہو مرے گرد کس لیے
کوئی بتاؤ مجھ کو کدھر جانا چاہیے
ہر جلوۂ جمال سے تنگ آ چکا ہے جی
اک روز زندگی سے گزر جانا چاہیے
جمشید سن رہے ہو سفر کی پکار کیا
طوفاں کو یوں نہ رہ میں ٹھہر جانا چاہیے

جمشید مسرور

تجھ سے بچھڑے تری ضرورت میں
یہ بھی اک رسم ہے محبت میں
ایک لمحے کا در میسر تھا
کیسے کٹتی وگرنہ فرقت میں
جس دُعا میں یقین زندہ ہو
پل گزرتے ہیں کتنی حیرت میں
یار تم کتنی خوبصورت ہو
کون ہو گا تمہاری قسمت میں
ایک صورت نظر نہیں آتی
کیا کیا جائے ایسی صورت میں
ہم کہاں سے کہاں نکل آتے
اپنی ہی ذات کی سیاحت میں
موت ہر حال میں قبول سہی
پر نہ آئے کسی کو غربت میں
سارا منظر بدل گیا جواد
کیسی ٹھوکر لگی ہے عجلت میں

جواد شیخ

جب خاک اُڑاتا ہوا نیندوں کا سفر ہو
پھر کیوں نہ کسی اور ہی دنیا سے گزر ہو
وہ میرے برابر سے نکل آیا تھا ورنہ
دیوار نہ تھی ایسی کہ جس میں کوئی در ہو
میں جسم سے گزرا ہوں یہی سوچ کے اکثر
شاید کہ تری روح کا اس راہ میں گھر ہو
یہ کیسی تمنا ہے کہ اس دشت میں فیصل
دریا ہو، کنارا ہو، سفینہ ہو، بھنور ہو

فیصل ہاشمی

فطرت

وہ کتے
دور سے دیکھ کر
زباں لٹکاتے
رال ٹپکاتے
ہانپتے کانپتے
دم ہلاتے
پاس آتے
تو......
چاٹتے
کاٹتے
بھونکتے
اور ہڈیاں چباتے

سونیا خان

ممتاز شاعر اور سفرنامہ نگار ڈاکٹر جعفر حسن مبارک سے حسن عباسی کی گفتگو

بقیہ انٹرویو

اس زمانے کے شاید چند ایک رسائل کے ادبی صفحات ہی گواہی دے پائیں کہ مجھے اشاعت پذیری کی کوئی خاص پرواہ رہی ہو۔۔۔ تاہم جب میں عملی زندگی میں داخل ہوا تو مختلف ادبی رسائل میں تواتر سے شائع ہونے والے احباب نے مجھے خصوصی طور پر اس جانب راغب کیا۔۔۔ اب بھی آپ اسے میری فطری کوتاہی کہہ لیں۔۔۔ کہ تخلیقات۔۔۔ مہینوں یونہی پڑی رہتی ہیں۔ اشاعتی حوالہ سے کسی میگزین کو اصرار کے باوجود بھجوانے کی توفیق نہیں ہو پاتی، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میرا تخلیقی عملیہ خود کو کسی اشاعتی ضرورت سے مشروط نہیں رکھتا۔

(۴) پہلی کتاب کون سی تھی اور کب شائع ہوئی؟

خالصتاً ادبی حوالہ سے دیکھا جائے تو۔۔۔

''نئے دنوں کے خواب'' ایسا شعری مجموعہ ہے کہ جو اشاعتی حوالہ سے میری شعری تخلیقات کو منظرعام پر لانے کا سبب بنا۔۔۔ اس حوالہ سے آپ اسے میرا اولین شعری مجموعہ بھی کہہ سکتے ہیں جو اگر میں بھول نہیں رہا ہوں تو ۲۰۰۰ء میں منظرعام پر آیا۔ بعدازاں ۲۰۰۷ء میں ''دریا سے صحرا تک'' سفرنامہ دبئی۔۔۔ اور ۲۰۱۰ء میں ''اپنے استنبول میں'' کے نام سے سفرنامہ ترکی طبع ہوا۔ ۲۰۱۱ء میں ''تمہارا ہنا سیکھ لیا ہے'' کے نام سے دوسرا شعری مجموعہ اشاعت پذیر ہوا۔۔۔ جب کہ ''کیپسر کے دیس میں'' کے نام سے سفرنامہ آسٹریا ''ساحل سے ساحل تک'' کے نام سے سفرنامہ سری لنکا۔۔۔ اور ریزہ کے نام سے ایک افسانوی مجموعہ زیرِ طبع ہیں۔ یہاں میرے لیے اپنی دو تین ایسی کتابوں کا ذکر شاید بے معنی یا بیجا نہ ہو جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے ''سوشل ورکر'' کے طور پر میرے کردار کو شباہت دینے میں معاون رہی ہیں۔ ان میں ''میں نے نشہ چھوڑ دیا''، ''علم المنشیات'' اور ''سحر قریب ہے'' کے نام سے اشاعت پانے والی کتابیں شامل ہیں جن کا زمانہ اشاعت ۱۹۹۰ء سے ۲۰۰۰ء تک ہے۔ یہ کتابیں ''ڈرگ ایڈکشن'' کے خلاف بطور سماجی کارکن میری جدوجہد کے تناظر میں منشیات کی نوعیت، ان کے اثرات، تدارک، علاج اور ان سے پیدا ہونے والے سماجی مسائل کے موضوعات سے بحث کرتی ہیں۔۔۔ تاہم میں نہیں سمجھتا کہ انھیں کسی بھی طور پر ادبی زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔

''حرفِ جعفر'' کے نام سے ایک ماہنامہ پچھلے پندرہ سولہ سال سے مسلسل شائع کرنے کا سزاوار بھی ہوں۔۔۔ جس کی نوعیت نیم سماجی، نیم ادبی ہے۔

(۵) سفرنامہ لکھنے کا خیال کیسے آیا؟ اور اب تک کتنے سفرنامے شائع ہو چکے ہیں؟

میں خود کا شمار ایسے لوگوں میں کرتا ہوں جن پر ''سفر کا پاؤں پر لکھا ہونا'' کا محاورہ صادق آتا ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد جب سے عملی زندگی کا آغاز ہوا ہے کبھی نجی اور کبھی پیشہ ورانہ حوالے سے وقفے وقفے سے کوئی نہ کوئی سفر ہمیشہ درپیش ہوتا ہے۔ جناب منیر نیازی کے ایک شعری مضمون کی طرح ایک دریا کے پار اترنے پر ایک اور دریا کا سامنا ہوتا ہے۔۔۔ ہر نئی سمت کا سفر حسی اور فکری سطح پر نئے تجربات اور تازہ محاصل کا ماخذ ہوتا ہے۔۔۔ میرے علمی آغاز میں میرے اسفار کے حسی اور فکری محاصل غزل، نظم، افسانے کی تخلیق کا محرک بنتے رہے۔۔۔ بعدازاں میرے حلقہ ادب کے احباب نے اصرار کیا کہ میں اپنے سیاحتی تجربات کو تخلیقی رُوداد کی صورت میں سامنے لاؤں۔۔۔ چونکہ افسانہ، ناول، تنقید، شاعری کی طرح اُردو ادب میں لکھے گئے بیشتر سفرنامے بھی میری مطالعاتی دستبرد سے محفوظ نہیں رہے تھے۔ اس لیے مجھے سفرنامے کے ادبی معیارات کا ادراک رکھنے میں کچھ ایسا مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ سو احباب کے اصرار پر میں نے اپنی سی کوشش کی۔ ''دریا سے صحرا تک'' کی صورت میں دبئی کا سفرنامہ منظرعام پر آیا۔۔۔ تو احباب کے ساتھ ساتھ عام قارئین کی جانب سے بے پناہ پسندیدگی ملی تو قلم اس ڈگر پر چل نکلا۔۔۔ اور اب صورت یہ ہے کہ اپنے سفر کا سفرنامے کی صورت میں تخلیقی بیان حسی اعتبار سے میرے لیے بہت طمانیت کا باعث بنتا ہے۔ اب تک دو سفرنامے ''دریا سے صحرا تک'' (سفرنامہ دوبئی) اور ''اپنے استنبول میں'' (سفرنامہ ترکی) منظرعام پر آ چکے ہیں جب کہ ''کیپسر کے دیس میں'' (سفرنامہ آسٹریا) طباعت کے مرحلے میں ہے۔۔۔

مزید برآں اٹلی اور سری لنکا سے متعلق دو سفرنامے بھی ابھی پائپ لائن میں ہیں۔

(۶) آپ اپنے ہم عصروں میں سے کس سے متاثر ہیں۔

ایک تخلیق کار کے طور پر ادبی حوالہ سے میرا خیال ہے کہ کلاسک ادب آپ کو معیارات اور عصری ادب آپ کو چیلنج دیتا ہے۔۔۔ مقابلے کی فضا میں عصری ادب پر نظر رکھے بغیر آپ کی تخلیقی جدوجہد ارتقا کا ساتھ دینے کی طاقت سے محروم ہو جاتی ہے۔ عصری ادب کا مطالعہ ہی آپ کے اندر نقد و نظر کی صلاحیت پیدا کرتا ہے جو آپ کی اپنی تخلیقی کانٹ چھانٹ میں معاون ہوتی ہے۔۔۔ اگر کوئی تخلیق کار اِس اَمر کا اعتراف نہیں کرتا کہ وہ معاصرین سے تخلیقی اعتبار سے کچھ نہیں سیکھ پا رہا تو یقیناً اُسے خود پسندی کا شکار قرار دیا جانا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو کسی کا اثر قبول نہیں کرتا وہ کسی کو متاثر کرنے کے مقابل بھی نہیں بن پاتا۔۔۔ مختلف ادبی رسائل و جرائد کی مطبوعہ تخلیقات میری نظری سے گزرتی ہیں تو تخلیقی اعتبار سے اکثر مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔۔۔ مجھے لگتا ہے کہ ہر تخلیق کار کسی نہ کسی حوالہ سے مجھ سے بہتر لکھ رہا ہے۔۔۔ اور یہی بات مجھے ادبی ریاضت کی طرف مائل رکھتی ہے۔۔۔ اپنے ان معاصرین سے بہ حیثیت مجموعی جن کے کام نے مجھے متاثر کیا ہے۔۔۔ کی فہرست ترتیب بھی دینا چاہوں تو مجھے اندیشہ ہے کہ بہت سے ناموں کے ذِکر کے باوجود سے نام نادانستگی میں اِس فہرست میں شامل ہونے سے رہ جائیں گے جس پر خود مجھے بعدازاں بہت تاسف ہو گا۔

(۷) اپنے ہسپتال اور فلاح و بہبود کے حوالے سے جو کام کیا اُس کے متعلق کچھ بتائیں؟

ذاتی حوالہ سے جب میں اپنے طرزِ حیات پر نظر ڈالتا ہوں تو وہ مجھے چار خانوں میں بٹی دکھائی دیتی ہے جن میں سے ایک خانہ نجی زندگی کا دوسروں میں پروفیشنل، ادبی اور سماجی و رفاہی کی تخصیص سمٹ آتی ہے۔۔۔ جہاں تک میری فلاحی، رفاہی اور بہبودی اور سماجی سرگرمیوں کا تعلق ہے۔تو میرے ادبی میلان کی طرح خوش قسمتی سے یہ خاصہ میری شخصیت کا حصہ رہا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے۔۔۔ سماجی بہتری کے لیے اپنی خدمات سرانجام دیتا رہا ہوں۔۔۔ سوشل ورک میں مصروف دیگر تنظیموں کی معاونت کے ساتھ ساتھ مجھے اپنے سماجی تنظیمی نیٹ ورک کے ساتھ مختلف سماجی میدانوں میں خدمات سرانجام دینے کے مواقع میسر آئے ہیں۔۔۔ ''اینٹی نارکوٹکس'' کے حوالے سے عوامی بیداری، شعور اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ''نارکوٹکس'' کے شکار افراد کی بحالی کے معاونت، وسائل اور ماحول مہیا کرنے کے حوالہ سے میری خدمات کو ملکی سطح پر مختلف نوع کے ایوارڈز کی صورت میں سراہا بھی جاتا رہا ہے۔۔۔ جب کہ فیصل آباد کی سطح پر طبی حوالہ سے مستحق مریضان کے لیے سہولیات اور وسائل مہیا کرنے کے لیے سماجی سطح کے ایک میکنزم ترتیب دینے کا اعزاز بھی حاصل رہا ہے۔فیصل آباد کے سب سے بڑے میڈیکل یونٹ ''الائیڈ ہسپتال'' کی انجمن فلاں مریضاں کے صدر کے طور پر مستحق مریضان کے لیے بروقت بلڈ ارینجمنٹ رخوراک کی فراہمی، ڈائلسز وارڈ کے کم ازکم چار بیڈز کے اخراجات کی اڈاپشن رعلاج کے لیے ضروری مشینری کی خرید کے حوالہ سے عطیات کی فراہمی اور تعمیر و مرمت کے اخراجات میں معاونت کے لیے سالانہ تین ساڑھے تین کروڑ کے بجٹ کا ارینجمنٹ میری ذمہ داری ٹھہرتی ہے، جس سے بہ احسن عہدہ برا ہونا ہمیشہ میری ترجیحات میں شامل رہتا ہے۔اس کے علاوہ چائلڈ رائٹس، ویمن رائٹس، جیلوں میں قیدیوں کی فلاح و بہبود، بہبودِ آبادی، Hiv، یوتھ اِمپاور، اور سپورٹس کے فروغ کے لیے بھی کام کیا۔ اسی بنا پر مجھے فیصل آباد کے ایدھی کے خطاب سے بھی نوازا جا چکا ہے۔

(۸) جب آپ پر تنقید ہوتی ہے تو کیسا لگتا ہے؟

آپ کو یہ سن کر شاید حیرت ہو کہ خود پر کی جانے والی تنقید میرے لیے تسکین کا باعث بنتی ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ میرے نزدیک تنقید اِس اَمر کا اعتراف ہوتا ہے کہ آپ اپنے عمل سے زندگی کے معمولات پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں، اگر کسی کو تنقید میسر ہوتی ہے تو وہ اس کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔۔۔ کیونکہ تنقید کی قبولیت یا ارتداد آپ کی اپنی صوابدید پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ آپ کے لیے خیر کا باعث تو بن سکتی ہے۔ باطنی اعتبار سے آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتی جو لوگ بھی خود پر کی گئی تنقید کو اہمیت دیتے ہوئے اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔۔۔ انھیں اپنے لیے بہتری تلاش کرنے میں سہولت رہتی ہے۔ میرا یقین ہے کہ تنقید اگر جواز اور استدلال کی بنیاد کی حامل ہو تو وہ کبھی بے برکت نہیں ہو سکتی۔۔۔ اس لیے میں تنقید کو خوشدلی سے قبول کرتے ہوئے اس کا تجزیہ کرنے

سے نہ تو ہچکچاتا ہوں اور نہ اپنے اِصلاح طلب پہلوؤں پر نظرِ ثانی کرنے سے گھبراتا ہوں لہٰذا میں اپنے ناقدین کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں ان کے تنقیدی عملیے کو ہرگز بے وقعت یا بے معنی نہیں بننے دوں گا۔

(۹) دیباچہ اور فلیپ نگاری کی امری حیثیت کیا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ ناقدینِ فن دیباچہ نگاری یا فلیپ نگاری کو اپنی ساکھ داؤ پر لگا دینے کے مترادف خیال کرتے تھے۔ وہ تخلیق کار کو تخلیقی معیارات حوالہ سے کسی رو رعایت کا حقدار سمجھے بغیر اپنی رائے کا اظہار کیا کرتے تھے۔۔۔ مگر اب یہ رویہ یکسر تبدیل ہو چکا ہے۔۔۔ اب دیباچہ نگاری یا فلیپ نگاری تخلیق کار کی کوسمیٹک ضروریات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے رائے دینے کے عمل کا نام ہے۔۔۔ تخلیق کار کی شباہتی لیپاپوتی کا جواز غالباً اِس اَمر پر رواج پا گیا ہے کہ تخلیق کار کو اس کے قاری کے لیے قابلِ قبول بنانے میں معاونت کی جا سکے۔۔۔ تخلیق اور تخلیق کار سے اس کے قاری کی دُوری یا کتاب اور قاری کے مابین مسلسل بڑھتی چلے جانے والی خلیج کو مدِنظر رکھا جائے تو یہ رویہ ایسا ناواجب بھی نہیں ہے۔۔۔ میری رائے میں کتابی مواد کی معاصر تنقیدی معیارات کے حوالہ سے پائی جانے والی کوتاہیوں کو سلیقے سے کیموفلاج کرتے ہوئے کتاب کی قاری تک رسائی میں مدد دینا کوئی ایسا معیوب عمل بھی نہیں ہے کہ جسے ادبی بددیانتی کا مظہر قرار دیا جا سکے۔۔۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ آپ کے پاس سنجیدہ تنقیدی مضامین کی صورت میں کھل کر اظہار کرنے کے مواقع بھی موجود ہوتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ دیباچہ نگاری یا فلیپ نگاری کے موجودہ معیارات کو سنجیدہ ادبی تنقیدی روایات کے تناظر میں دیکھے جانے کی شرط کو خیرباد کہہ دیا جانا چاہیے۔ دیباچہ نگار یا فلیپ نگار کا اوّلین مقصد یہی ہونا چاہیے کہ قاری کو کتاب مواد سے گزرنے کی تحریک دی جائے۔

(۱۰) بدلتے ہوئے ادبی رویوں سے مطمئن ہیں؟

ادب تہذیبی، فکری، سماجی ارتقاء کے ایک اہم عنصر کے طور پر اپنے وجود کا جواز فراہم کرتا ہے۔ اس لیے ارتقائی حوالہ سے ادبی نظریات یا رویوں میں جو تبدیلیاں رُونما ہوتی ہیں۔ ان سے انفرادی سطح پر کسی کے عدم اطمینان کا سوال پیدا نہیں ہونا چاہیے، جیسے جیسے کسی معاشرت کا منظرنامہ بدلتا ہے۔۔۔ اُسی طور پر اس کیا ادب، ادبی رجحانات رویوں اور نظریات میں تبدیلی وقوع پزیر ہونا ایک فطری عمل ہے۔۔۔ ہر نیا دور نئے ادبی مباحث کے ساتھ وارد ہوتا ہے۔۔۔ جدیدیت، مابعد جدیدیت کی منزل سے ہمکنار ہوتی ہے۔ ساختیات کو پسِ ساختیات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ کبھی مقصدیت اس پر غلبہ پا لیتی ہے تو کبھی ادب برائے خود اس کا تقاضا ٹھہرتا ہے۔ کبھی علامت نگاری رواج پا جاتی ہے تو کبھی تجریدیت اس پر اپنے نفوذ کا اعلان کر دیتی ہے۔۔۔ ادب ہر نئے تجربے اور ہر نئی تحریک کو خوشدلی سے قبول کرتے ہوئے اُسے پھلنے پھولنے کے تمام مواقع فراہم کرتا ہے۔۔۔ جہاں تک تخلیق کار کے طرزِ عمل یا طرزِ کار میں تبدیلیوں کا تعلق ہے تو تسلیم کیا جانا چاہیے کہ انٹرنیٹ تخلیق کار کے اپنے قاری سے انٹرایکشن کی صورتوں کو ایسی انقلابی تبدیلیوں سے روشناس کروایا ہے کہ محض ایک دہائی قبل جس کا اِدراک یا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کمپیوٹر ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ کے مؤثر کردار کے باصف ادب اور ادیب ''پین اینڈ پیپر فری لٹریچر'' کے دور میں داخل ہونے جا رہا ہے۔۔۔ گویا بات اب رویوں کے بدلنے تک محدود نہیں رہی۔۔۔ ادب کی طرزِ تخلیق، طرزِ اظہار اور طرزِ اشاعت میں بہت تیزی سے تبدیلیاں وقوع پذیر ہونے والی ہیں جن کے لیے ہمیں ذہنی طور پر تیار رہنا ہوگا۔

(۱۱) جدید شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جدید شاعری سے مراد اگر نئے ہیئتی تجربات یا نئے مضامین کی شعربندی ہے۔۔۔ تو معاف کیجیے گا۔۔۔ یہ جدید شاعری زمانۂ قدیم سے عہد بہ عہد تواتر سے ہوتی چلی آ رہی ہے۔ میرے نزدیک جدید شاعری کی معنویت یہ ہے کہ میر، مصحفی، ذوق، غالب۔۔۔ غرض کسی بھی کلاسک شاعر کا کلام عہدِ جاریہ میں تسکینِ ذوق کا جواز رکھتا ہے تو وہ جدید ہے۔ شاعری جو آپ کی سانس کے ساتھ سانس لیتی ہے خواہ اس کا تخلیقی زمان کتنا ہی قدیم کیوں نہ ہو۔۔۔ جدید کہلوانے کا ہر حق محفوظ رکھتی ہے۔

(۱۲) مستقبل کے عزائم کیا ہیں؟

میں تو اِس اَمر کا قائل ہوں کہ اگر آپ کچھ عزائم یا دوسرے لفظوں میں اہداف رکھتے ہیں تو انھیں

زمانۂ حال میں بھی حاصل کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ پچھلے کچھ عرصہ سے میں نے ادبی حوالہ سے اپنے بکھرے ہوئے تخلیقی کام کو سمیٹ کر اُسے مطبوعہ شکل میں لانے کی کوشش ہے۔ ایک پلندے کو سمیٹتا ہوں تو ایک اور کو بکھرا پاتا ہوں پھر اُسے سمیٹنے میں لگ جاتا ہوں۔۔۔ میرے ساتھ تو ایک عرصہ سے یہی واردات چل رہی ہے۔۔۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے۔۔۔ آپ کا زمانہ حال آپ کے مستقبل کا تخلیق کار بنتا ہے۔ میں اپنے مستقبل میں کسی ایسی بڑی تبدیلی کی توقع نہیں رکھتا جو میرے زمانۂ حال سے مماثل نہ ہو۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میرے پاس کچھ بہتر کرنے کی استعداد ہے تو وہ زمانہ حال ہی میں ہے۔

(۱۳) فیصل آباد کی ادبی فضا کے بارے میں کچھ بتائیں مستقبل میں کون سے شاعر اس شہر کی پہچان بنیں گے۔

ادبی حوالہ سے فیصل آباد کی مٹی ہمیشہ بہت زرخیز رہی ہے۔۔۔ اس شہر ہنروراں نے ایسے ایسے ہنرور پیدا کیے ہیں کہ جن کی فکری و فنی اپج اور کمال کا ایک زمانہ معترف رہا ہے۔۔۔ ن۔م۔ راشد کا تعلق اسی خطۂ زمین سے تھا۔ سلیم بے تاب، جوہر جالندھری، حافظ لدھیانوی، عبیر ابوذری، شوق عرفانی، احسن زیدی، شہزادہ حسن، قمر لدھیانوی، طالب جالندھری، افتخار نسیم، عدیم ہاشمی، ممتاز کنول، خاور زیدی، نذر جاوید، اقبال اختر ایسے شعرا ہیں کہ جو اب ہم میں نہیں ہیں مگر ان کا شعری آہنگ فیصل آباد کے مجموعی شعری آہنگ کو ایک مخصوص شناخت دینے میں کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ افضل احسن رندھاوا، ڈاکٹر ریاض مجید، افسر ساجد ایسے نام ہیں جو عالمی ادبی منظر نامے پر کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ارشد جاوید، قیوم ناصر، افضل خاکسار، احمد شہباز خاور، نصرت صدیقی، اشرف یوسفی، کوثر علی، خاور جیلانی، انجم سلیمی، ظفر عجمی، مقصود وفا، علامہ ضیا حسین ضیا، شاہد اشرف، ثناء اللہ ظہیر، راشد اقبال، کاشف نعمانی، محمود رضا سید، منصف ہاشمی، علی زریون اور سردار آصف آرائیں کا شمار عمدہ اشعار کہنے والوں میں ہوتا ہے کہ فیصل آباد کے شعری شباہت کے رنگ انھی کی تخلیقی کارفرمائی کے مرہون ہیں۔۔۔ افضال نوید، شہزاد اسلم گو۔۔۔ بیرون ملک جاتے ہیں، مگر یہاں کی شعری فضا آج بھی اُن کا حوالہ پا کر خوشگوار محسوس ہوتی ہے۔ شہزاد بیگ، اشفاق بابر، یاور نقوی، اشرف اشعری عہد جاریہ کے ایسے فعال نام ہیں کہ جس کی ادبی فعالیت حیران کر دینے کا نامہ رکھتی ہے۔ اُردو افسانے کی تخلیق کے باب میں طاہرہ اقبال اور گلزار ملک کے مؤقر ادبی جرائد میں اپنی جگہ بناتے، اکثر دکھائی دے جاتے ہیں۔ نثر و شاعری کے حوالہ سے خواتین کے کردار کا تذکرہ کیا جائے تو محترمہ گلنار نقوی، محترمہ کنیز اسحاق، محترمہ نسیم صحرائی، محترمہ ضیاء بتول، محترمہ فوزیہ ہاشمی، محترمہ عنبرین اشعر، محترمہ رابعہ سرفراز، محترمہ فرحت صدیقی، محترمہ ناز فاطمہ، محترمہ سعیدہ ہاشمی اور محترمہ رفعت یاسمین فیصل آباد کے نسائی ادب کو پہچان دینے میں اہم کردار سرانجام دیتی دکھائی دیتی ہیں۔۔۔ اس حوالہ سے ڈاکٹر سہیل عباس جو ان دنوں ٹوکیو میں مقیم ہیں، ڈاکٹر شبیر احمد قادری، ڈاکٹر آصف اعوان، ڈاکٹر سعید احمد، ڈاکٹر اصغر علی بلوچ (شعبہ اُردو جی سی یونیورسٹی فیصل آباد) خاصے فعال نظر آتے ہیں۔

فیصل آباد کے منتخب شعراء و ادباء کی مندرجہ بالا فہرست کو اگر ادبی حوالہ سے تخلیقی صلاحیت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بے اختیار زبان پر۔۔۔

ع ہر ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

کا مصرعہ جاری ہو جاتا ہے۔

(۱۴) قارئین کے لیے کوئی پیغام سوالنامہ۔

عصری ادب کی فعالیت کے حوالہ سے عموماً سوال اُٹھایا جاتا ہے کہ آج کا ادب قارئین کو متوجہ کرنے سے محروم ہوتا چلا جا رہا ہے۔۔۔ میں اس نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں رکھتا۔ آج کا ادب اپنے قاری سے اتنی ہی کشش رکھتا ہے جتنی کلاسک ادب اپنے، قدیم قاری کے لیے رکھتا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ آج کا قاری۔۔۔ اپنے ناقدانہ ردِعمل کو اظہاری رویے میں ڈھالنے کے ذوق سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ کتاب سے استفادے کے باوجود اپنی ریڈرشپ کے ماحصل کو خارج از بیان کر دینے کے رویے نے خواہ اس کی وجہ کوئی بھی ہو۔۔۔ کتاب کی مطالعاتی رغبت کو تحرک دینے میں رُکاوٹ پیدا کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قاری کا مطالعہ اُسے جو بھی نتائج دے، ان کے اظہار سے مباحث کو اپنا جواز پانے کا موقع ملتا ہے اور علمی و ادبی تحرک انھی مباحث ہی سے اپنا وجود پاتا ہے۔ میں قارئین ادب سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنی آراء خود تک محدود رکھنے کی بجائے اُسے مکالمے کا جواز دیں گے۔۔۔ کہ ادبی جمود کے خاتمے کی یہی تہذیب ہے۔

تم اپنے آپ سے آگے نکل کے دیکھو نا
ندی کی دھار پہ اب کے سنبھل کے دیکھو نا
سب اہل جور و جفا ایک جیسے لگتے ہیں
نگہ کا آئنہ خانہ بدل کے دیکھو نا
وہ جن سے تم نے زمانے کو زیر بار کیا
انہی کھلونوں سے تم بھی بہل گے دیکھو نا
وفا کی شرط تو مصلوب کر کے چھوڑے گی
سفر ہے دار کا کچھ دیر چل کے دیکھو نا
تماشا زیست کا پھر دم لبوں پہ لے آئے
تم اس کے عشق میں کچھ دیر جل کے دیکھو نا
سمیٹ لے گی یہ دھرتی یہ خاک کی چادر
ذرا سا اشک کی مانند مچل کے دیکھو نا
کنول یقین کی دولت سے مالا مال کریں
دلوں پہ معجزے اپنے عمل کے دیکھو نا

آسناتھ کنول

زندگی سے ہجر کے منظر ہٹانے کے لیے
جانے کب آئے گا وہ آنکھیں چرانے کے لیے
شام ہوتے ہی میں اپنا غم بھلانے کے لیے
چل نکلتا ہوں کہیں غزلیں سنانے کے لیے
آج پھر تیرے لیے میں اور کچھ لایا نہیں
موتیے کے پھول ہیں زلفیں سجانے کے لیے
دیر تک ہی سامنے بیٹھا رہا خاموش سا
میں گیا حالِ دل اپنا سنانے کے لیے

میں نے اس سے روٹھ کر برسوں کیا ہے انتظار
کاش وہ آتا کبھی مجھ کو منانے کے لیے
اے محل کے شاہزادے مجھ کو بس اتنا بتا
کوئی کٹیا مل سکے گی سر چھپانے کے لیے
اُس عجائب گھر میں تصویریں پرانی ہیں مگر
چور آتے ہیں سدا ماضی چرانے کے لیے
ایک آوارہ مسافر کس طرح ٹھہرے یہاں
دشت میں چھالے ملیں گے من لبھانے کے لیے

آفتاب خان

تیری چاہت سنبھال رکھی ہے
جاں رہین وبال رکھی ہے
آنکھ کے دائرے میں رہتے ہو
آنکھ تم پر کمال رکھی ہے
دھڑ بچانے کو ہر معزز نے
اپنی پگڑی سنبھال رکھی ہے
سرد شامیں بھلا نہیں سکتا
یاد میں تیری شال رکھی ہے
کس دعا کا اثر ہے یہ ابرار
ہر مصیبت جو ٹال رکھی ہے

ابرار احمد (ڈاکٹر)

اُڑے نہیں ہیں اُڑائے ہوئے پرندے ہیں
ہمیں نہ چھیڑ ستائے ہوئے پرندے ہیں
قفس میں قید کرو یا ہمارے پر کاٹو
تمہارے جال میں آئے ہوئے پرندے ہیں
ہوا چلے گی تو بچے اُڑائیں گے ان کو
یہ کاغذوں سے بنائے ہوئے پرندے ہیں
جمے ہوئے ہیں یہ شاخوں پہ اس طرح جیسے
شجر کے ساتھ اُگائے ہوئے پرندے ہیں
فلک پہ جن کو ستارے سمجھ رہے ہیں لوگ
وہ چاندنی میں نہائے ہوئے پرندے ہیں
بلندیاں ہیں ہمارے مزاج میں شامل
کہ ہم فلک سے گرائے ہوئے پرندے ہیں
ہمارے پاس ہی آئیں گے لوٹ کر باقی
ہمارے جتنے سدھائے ہوئے پرندے ہیں

باقی احمد پوری

چپکے سے آ کے دل میں جو آباد ہو گیا
میں تو غمِ زمانہ سے آزاد ہو گیا
کیسی تمہارے پیار میں چپ لگ گئی مجھے
مہر و وفا کی ان کہی رُوداد ہو گیا
جب سے اسیر زُلفِ گرہ گیر میں ہوا
تب سے غمِ حیات سے آزاد ہو گیا
اب عیب ڈھونڈتا ہوں، بہت اپنی ذات میں
خود اپنے ہی وجود کا نقاد ہو گیا
جب سے نظامِ شہر تمنا تجھے دیا
آباد ہو گیا، کبھی برباد ہو گیا

غم اس قدر ڈھائے کہ اب کوئی غم نہیں
پیہم ستم سے خوگر بیدار ہو گیا
اک انجمن ملی مجھے تو اُس کی ذات میں
خالدؔ سے مل کے اپنا تو دل شاد ہو گیا

خالد نصر راجہ (میجر (ر))

ہوا نے راستہ روکا ہوا ہے
دیا تو ہاتھ پر رکھا ہوا ہے
ترا ہے آسماں اُس پار شاید
ادھر اک شور سا برپا ہوا ہے
ہمیں معلوم ہے تعبیر اس کی
کہ ہم نے خواب یہ دیکھا ہوا ہے
جسے میں بھول آیا ہوں کہیں پر
وہ میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے
میں اُس کی زندگی کی خیر مانگوں
پرندہ شاخ پر بیٹھا ہوا ہے
یہ دنیا گنبدِ بے در ہے زاہدؔ
یہاں ہر بات کا چرچا ہوا ہے

زاہد سعید زاہدؔ

تم سمجھتے ہو کہ ہیں غم آفریں اُجڑے ہوئے
ہم بڑے خوش بخت ہیں ہم تو نہیں اُجڑے ہوئے
دل ہے کیا بس ایک بوسیدہ عمارت ہے جہاں
ہیں مقفل خواب گاہیں شہ نشیں اُجڑے ہوئے
روند کر رکھ دی گئی آئینہ خانوں کی بہار
ماہ رو اُجڑے ہوئے ہیں، نازنیں اُجڑے ہوئے

کس قدر آسیب دیدہ ہے یہ خوابوں کی زمیں
بستیاں آباد ہیں لیکن مکیں اُجڑے ہوئے
مطمئن ہیں ہم اگر تجھ کو گنوا کر تو ہمیں
کیوں دکھائی دے رہے ہیں عالمیں اُجڑے ہوئے
ہم کہیں اُجڑے ہوئے ہیں، تم کہیں تصویرِ غم
تم کہیں تصویرِ غم ہو، ہم کہیں اُجڑے ہوئے
آپ سب کے منصب و مسند کی ہیں بنیاد ہم
اور ہم سب آپ کے زیرِ نگیں اُجڑے ہوئے

سرور ارمان

اُس نے کیسا ملال رکھا ہے
مجھ کو برسوں سے ٹال رکھا ہے
ایسا لگتا ہے اُس نے سینے سے
اپنا دل ہی نکال رکھا ہے
شب فرقت میں تیری یادوں نے
میرا کتنا خیال رکھا ہے
پیار کی کیوں ہے اس قدر قلت
عشق کا کس نے کال رکھا ہے
تو نے اک عمر سے یہاں مجھ کو
درد و غم سے نڈھال رکھا ہے
یہاں زاہد نے مے کو ہم پہ حرام
اور خود پر حلال رکھا ہے
ایک چہرے نے یارؔ مدت سے
مجھ کو حیرت میں ڈال رکھا ہے

سہیل یارؔ

آس کا جگنو کہیں سویا ہوا ہے آج کل
روشنی کا راستہ کھویا ہوا ہے آج کل

جانے کشت جاں سے پھوٹیں کیسے کیسے حادثات
نفرتوں کا بیج پھر بویا ہوا ہے آج کل
کاتبِ تقدیر سے میں اور کیا مانگوں کہ جب
اُس نے جو پہلے دیا، کھویا ہوا ہے آج کل
موسمِ گل کی خبر ہو عام کیسے باغ میں
خوشبوؤں کا قافلہ سویا ہوا ہے آج کل
کس قدر نکھرا ہوا ہے رنگ سارے شہر کا
غم کی برساتوں نے سب دھویا ہوا ہے آج کل
تیرے چہرے سے جھلکتی ہے اداسی ذات کی
پھر صدف تجھ میں کوئی رویا ہوا ہے آج کل

صغرا صدف (ڈاکٹر)

لوگ پابندِ سلاسل ہیں مگر خاموش ہیں
بے حسی چھائی ہے ایسی گھر کے گھر خاموش ہیں
دیکھتے ہیں ایک دوجے کو تماشے کی طرح
ان پہ کرتی ہی نہیں آہیں اثر، خاموش ہیں
ہم حریفِ جاں کو اس سے بڑھ کے دے دیتے جواب
کوئی تو حکمت ہے اس میں ہم اگر خاموش ہیں
اپنے ہی گھر میں نہیں ملتی اماں تو کیا کریں
پھر رہے ہیں مدتوں سے دربدر، خاموش ہیں
ٹوٹنے سے بچ بھی سکتے تھے یہاں سب آئنے
جانے کیوں اس شہر کے آئینہ گر خاموش ہیں
پیش خیمہ ہے شناورؔ یہ کسی طوفان کا
سب پرندے اُڑ گئے ہیں اور شجر خاموش ہیں

عمران شناور

زندگی سی کھٹی میٹھی فالسے کی جھاڑیاں
بچپنے کے خواب جیسی فالسے کی جھاڑیاں

رنگ کچے تھے، ہماری مٹھیوں میں رہ گئے
ہیں تری، میری کہانی، فالسے کی جھاڑیاں
بس ذرا سی دیر کو، ہم چھاؤں میں ان کی رہے
دلبروں کی دوستی سی، فالسے کی جھاڑیاں
چلمنوں میں کھیلتی، دیوار پر ہنستی ہوئیں
آنگنوں میں سانس لیتی، فالسے کی جھاڑیاں
یاد کی پگڈنڈیاں پر ننھے پیروں میں بھاگتی
اک ستارہ ایک تتلی، فالسے کی جھاڑیاں

فرحت زاہد

Petition Prayer

سمیٹو مجھ کو ہالے میں
اُداسی چھین لو میری
ہوا بن کے جو سرگوشی
بنی دہلیز بیٹھی ہے
میرا دل اس سے ڈرتا ہے
تمہارا نام جپتا ہے
گھڑی بھر کو جو آ جاؤ
تم اس کا رخ ذرا موڑو
میری جاں کو کرو محفوظ
میرے ماتھے پہ بوسہ دو
یوں میرا ہاتھ تھامو
اور اُداسی چھین لو میری
مجھے نہ موتی ہیں درکار
نہ مجھ کو دنیا سے ہی پیار
میرا گہنا، میرا زیور
تمہارا لمس
تمہارا نام
بھلے تم کرنا باقی سب
رہے جو اس جہاں کے کام
مگر اک بار آ جاؤ
میرے دل کو تسلی دو
میری جاں کو کرو محفوظ
میرے ماتھے پہ بوسہ دو
بھر دیوں......روح کو بانہوں میں اپنی اور
اُداسی چھین لو میری

فوزیہ بھٹی

جلوۂ نور کے لیے جسم نقاب ہو گیا
تُو تو رہا حجاب میں، میں بے حجاب ہو گیا
شہر میں اتنی خیر ہے، حاکم شہر کے سبب
لوگ شہید ہو رہے مرنا ثواب ہو گیا
کرب و بلا کے بعد اب کشتی نوح چاہیے
پیاس کی بارگاہ میں پانی عذاب ہو گیا
چشم فلک نما کھلی خواب گرا کے سو گئی
خواب کے ٹوٹنے کا غم باعثِ خواب ہو گیا
صفحوں میں مجھ کو ڈھونڈیے سطروں میں مجھ کو پایئے
لکھتے ہوئے کتابِ عشق میں بھی کتاب ہو گیا
عمر کے کاروبار میں سانسوں پہ بات رُک گئی
بات ابھی چلی نہ تھی اور حساب ہو گیا

ندیم بھابھہ

سراب

وصل کے فسانے سے
ہجر کے زمانے تک
فاصلہ ہے صدیوں کا
فاصلہ کچھ ایسا ہے
عمر کی مسافت بھی
جس کو طے نہ کر پائے
منزلوں کے ملنے تک
آرزو ہی مر جائے
چار سمت آہوں کے
دل فگار منظر ہیں
منظروں کی بارش میں
آنکھ بھیگی رہتی ہے
آئنے سے کہتی ہے
کس لیے سنورتی ہوں
کیوں سنگھار کرتی ہوں
اجنبی مسافر کا
انتظار کرتی ہوں
روز روز جیتی ہوں
روز روز مرتی ہوں

ناز بٹ

کراچی

چپ کھڑی ہوں پسِ دیوار میں کب بولتی ہوں
بولتا ہے مرا پندار میں کب بولتی ہوں
سرنگوں، مہر بلب میں تو کھڑی ہوں کب سے
بولتے ہیں در و دیوار میں کب بولتی ہوں
جو تجھے چاٹ رہی ہے کسی دیمک کی طرح
آگہی کی ہے یہ گفتار میں کب بولتی ہوں
ایک مدت سے ہوں صحرا کی مسافر پھر بھی
یاد جب آتا ہے گھر بار میں کب بولتی ہوں
معتبر شہر ہنر میں مجھے رکھنے کے لیے
بولتے ہیں مرے افکار میں کب بولتی ہوں
چپ کے صحرا کی خموشی نہیں توڑی میں نے
اس نے پوچھا ہے کئی بار، میں کب بولتی ہوں
درد موسم کو رکھا دل میں چھپا کر پھر بھی
آنکھ کر دیتی ہے اظہار میں کب بولتی ہوں

حجاب عباسی

کچی کچی کہانیاں دل کی
اور پھر بے زبانیاں دل کی
عمر بھر کی مسافتوں کے بعد
ہائے رے رائیگانیاں دل کی
عشق کے بے کنار صحرا میں
کم نہیں بے کرانیاں دل کی
یہ جو کچھ مہر ہے محبت ہے
ہیں یہ سب مہربانیاں دل کی
دوستوں سے امید باندھی ہے
دیکھیے خوش گمانیاں دل کی
اُداس رہ کر سبھی کو غمگین کر رہا ہوں

سعید الظفر صدیقی

خواب میں اونچے چناروں کو سلگتا دیکھنا
خود کو تیرے واسطے شب بھر مہکتا دیکھنا
دیکھنا چہرے پہ تیرے صبح کی تابانیاں
اور آنکھوں میں تری سورج اُترتا دیکھنا
سیپیوں کو ساحلوں کی نرم گیلی ریت پہ
پہلی پہلی بوند کی خاطر ترستا دیکھنا
دھوپ میں جلتے ہوئے ان پتھروں پر بیٹھ کر
ذات کے جنگل میں بوندوں کو برستا دیکھنا
خود کو دیواروں میں گھر کی قید کر لینا مگر
روز اپنے سائے کو باہر بھٹکتا دیکھنا

سیما غزل

خزاں کی رُت ہے جنم دن ہے اور دھواں اور پھول
ہوا بکھیر گئی موم بتیاں اور پھول
وہ لوگ آج خود اک داستاں کا حصہ ہیں
جنہیں عزیز تھے قصے، کہانیاں اور پھول
یہ سب ترے مرے اظہار کی علامتیں ہیں
شفق کے رنگ میں شعلہ، لہو، زباں اور پھول
یقین کر کہ یہی ہے بجھے دلوں کا علاج
تری وفا، تری چاہت، ترا گماں اور پھول
ظفر میں صورتِ خوشبو قیام کرتا ہوں
سو ایک سے مجھے لگتے ہیں سب مکاں اور پھول

صابر ظفر

کبھی نہ رونے کی خود کو تلقین کر رہا ہوں
میں اپنے اشکوں کی آج تدفین کر رہا ہوں
کبھی محبت کی بھیک لگتی ہے نیک نامی
کبھی یہ لگتا ہے اپنی توہین کر رہا ہوں
مجھے بھی ساقی اب احتیاجِ سبو نہیں ہے
میں اپنے خوں سے ہی شام رنگین کر رہا ہوں
جو خواب دیکھے تھے میں نے سارے بکھر گئے ہیں
نئے سرے سے اب اپنی تدوین کر رہا ہوں
کسی کی خوش قامتی نگاہوں میں کیا بسی ہے
طوافِ سیارگان و پروین کر رہا ہوں
میں خوش نہیں ہوں تو اور کوئی بھی خوش رہے کیوں
اُداس رہ کر سبھی کو غمگین کر رہا ہوں

فاضل جمیلی

تجدیدِ ہجر، تعبیرِ ہجر کے بعد
کراچی میں مقیم ممتاز شاعرہ
حجاب عباسی کا شعری مجموعہ
ثباتِ ہجر
شائع ہوگیا ہے
ناشر: دُنیا ادب، کراچی

خون میں زہر تھا صداقت کا
دکھ اُٹھایا ہے تیری چاہت کا
آ ترے لب کو چومنے کے سوا
کوئی چارہ نہیں محبت کا
پھر اُسی بے وفا کو ڈھونڈوں گا
کچھ بھروسہ نہیں طبیعت کا
میں کہاں اس مقام کے قابل
مجھ پہ الزام ہے محبت کا
دشت دل میں ٹھہر ٹھہر سا گیا
ایک اک لمحہ تیری فرقت کا
اور سارے بیان جھوٹے ہیں
حُسن ہی نام ہے حقیقت کا

جمیل یوسف/اسلام آباد

نظر باز

بدن میں حرارت جو کم ہوگئی ہے
کسی گرم چولہے کی جانب بڑھو
دھوپ سینکو
اگر آگ یا دھوپ سے آشنائی نہ ہو پائے
تو
سرد پانی میں اترو
کہ لوہے کو لوہے سے کٹنے کی عادت ہے
تم جانتے ہو
مجھے قحبہ خانوں میں جانے کی عادت نہیں ہے
مگر جب میں تنہائیوں کی اذیت سے تھک جاؤں
تو اس گلی کی طرف جا نکلتا ہوں
کھلتے دریچوں سے آواز دیتی ہوئی لڑکیاں
اپنی جانب بلاتی ہیں، آواز کانوں میں رس
گھولتی ہے تو سب وحشتیں بھاگ جاتی ہیں
اور میں طلسمی محلکوں میں محسوس کرتا ہوں خود کو
مجھے فخر ہے ایسے لمحوں میں بھی، میں نے
خود کو کبھی
قحبہ خانوں کی تاریکیوں میں اترنے دیا ہے
نہ ایماں کے چولہے کو ٹھنڈا کیا ہے
جب نظر بھر کے تکنے سے اور
تکنے والی نگاہوں کی خیرات سے کام چل جائے تو
قحبہ خانوں کی تاریکیوں میں بھلا کون اُترے؟

حسن جمیل/واہ کینٹ

اے ہجر ترے ناز اُٹھانے سے رہی میں
بجھتی ہوئی آنکھوں کو جلانے سے رہی میں
دریا میں کوئی اشک بہانے سے رہی میں
پانی میں نئی آگ لگانے سے رہی میں
خود کو ہی سجا سکتی ہوں آمد پہ تمہاری
دیوار و در و بام سجانے سے رہی میں
وہ بیٹھ کے سنتا تو کوئی بات تھی آخر
غیروں کو تو حالات سنانے سے رہی میں
اس دشت نوردی سے گلہ ہے تو بس اتنا
اس دشت نوردی میں ٹھکانے سے رہی میں
وہ کون گلی ہے جہاں تجھ کو نہیں ڈھونڈا
جنگل میں تو آواز لگانے سے رہی میں
ورنہ وہ نظر مجھ کو بھی خاطر میں نہ لاتی
اس دل میں تو ماہین بہانے سے رہی میں
میں راشدہ ماہین ملک ہوں ارے ناداں
رستے میں ترے پلکیں بچھانے سے رہی میں

راشدہ ماہین/اسلام آباد

آنکھ سے خواب لے گیا اور وہ اشک بھر گیا
عشق تھا یا خمار تھا وقت کے ساتھ اُتر گیا
خوشبو کو تازگی ملی، رنگوں کو روشنی ملی
آئی بہار تو ہر ایک پھول سنور سنور گیا
شام ہوئی تو اس کی یاد روح میں جلوہ گر ہوئی
ہم ہوئے دربدر تو کیا کوئی تو اپنے گھر گیا
کشت سراب کھل گئی، منزل خواب مل گئی
میں نہ پہنچ سکا وہاں پر مرا ہم سفر گیا
تیری صدا کا جوش ہے، عرش اُدھر خموش ہے
دیکھ لے اے دریدہ دل تیرا بھی اب اثر گیا
کاسۂ زہر اس کے ہاتھ، شہر کا شہر اُس کے ساتھ
جان عزیز تھی بہت ملنے اُسے مگر گیا
دار پہ سربلند ہوں، شاعر دل پسند ہوں
لے کے عروج پر مجھے ساتھ مرا ہنر گیا
شوقِ سوال کی قسم، رنگ جمال کی قسم
تیرے جلال کی قسم میں وہ نہیں جو ڈر گیا
تیرا مرا ہے ربط خاص، بس میں نہیں مرے حواس
تو نے کہا تو جی اُٹھا تو نے کہا تو مر گیا

علی یاسر/اسلام آباد

اگر آنکھوں میں کوئی خواب سا در آنے لگتا ہے
کسی اندیشۂ موہوم سے ڈر آنے لگتا ہے
یہ کیسی چاندنی ویران آنکھوں میں اُترتی ہے
اندھیرا سا پس اشک منور آنے لگتا ہے
اسے اچھا نہیں لگتا اگر بے خانماں رہنا
وہ رستہ کیوں بدلتا ہے کہ جب گھر آنے لگتا ہے
فصیل جسم و جاں پر خامشی جب رقص کرتی ہے
غنیم شہر کا سا شور اندر آنے لگتا ہے
تکلم کے سبھی پیکر خموشی اوڑھ لیتے ہیں
جب اس کے لب پہ میرا نام کوثر آنے لگتا ہے

کوثر محمود (ڈاکٹر)/راول پنڈی

مری پلکوں پہ جو ٹھہرا ہوا ہے
سمندر کی طرح پھیلا ہوا ہے
مرے برباد اشکوں کا تلاطم
تری آنکھوں میں کیوں اُترا ہوا ہے
مجھے سمجھا رہا ہے آج دیکھو
جو اپنے آپ میں اُلجھا ہوا ہے
سمیٹوں میں بھلا کس کس کو تنہا
جسے دیکھو وہی بکھرا ہوا ہے
مجھے جو مل گیا میرا نہیں ہے
ملا جو تجھ سے وہ تیرا ہوا ہے
نوید وصل کے ملتے ہی دل میں
عجب اک حشر سا برپا ہوا ہے

جہاں آرا تبسم

لفظ جڑتے نہیں
کوئی مصرع بناتے نہیں
بوجھ اُٹھاتے نہیں
مجھ سے کہتے ہیں
ہم کوئی مزدور ہیں
گٹھڑیاں
کترنوں سے بھری گٹھڑیاں
کیوں اُٹھاتے پھریں
کوئی مجبور ہیں
ہم سے کس نے کہا ہے
کہ ہم بارڈھونے پہ مامور ہیں
خواب اوروں کے سارے
یہ شانے ہمارے
بہت خوب
جاؤ کسی اور کو ڈھونڈ لاؤ
جو معنی کی بجری بھری یہ تغاری
اُٹھا بھی سکے
سر جھکا بھی سکے
جا تلاشو انہیں
وہ جو احساس کی ریت کی بوریوں کے لیے
ریڑھ کی ہڈیوں کو کماں کرسکیں
کارلاحاصلی بے تکان کرسکیں
ہم بہت تھک چکے
اور تنگ آگئے
اپنے شانوں پہ خوابوں کے زنگ آگئے
ہڈیوں میں بھی معنی کے رنگ آگئے
زنگ بھی اتنا گہرا کہ کٹتا نہیں
رنگ بھی ایسے پکے کہ اُڑتے نہیں
ہاتھ جوڑے مگر

دانیال طریر

دُنیا تو ہم سے جینے کا رشتہ بھی چھین لے
بس میں جو ہو تو منہ کا نوالہ بھی چھین لے
ہم کو بس ایک لمحہ محبت کا چاہیے
ایسا نہیں تو اس کی تمنا بھی چھین لے
اب آ بھی جائے موت جو آنی ہے ایک بار
اور آ کے ہم سے موت کا خدشہ بھی چھین لے
رہزن بہت ہیں راہ میں ایسا نہ ہو کہیں
آنکھوں سے کوئی خواب دریچہ بھی چھین لے
وہ یاد آ کے چھین لے آنکھوں سے نیند بھی
ہم سے ندیم خوابوں کی دُنیا بھی چھین لے

ریاض ندیم نیازی

کہانی سننے کے دوران سو گیا تھا میں
اُٹھا تو سورہ والناس پڑھ رہا تھا میں
مجھے وہ آج بھی بھولا نہیں سنہری جسم
کہ جس کو دیکھ کے پلکوں سے گر پڑا تھا میں
کچھ اس لیے بھی پلٹنا محال تھا مری جاں
زمیں کی حد سے بہت دور آ چکا تھا میں
یہ اور بات کہ اب راکھ ہو گیا ورنہ
ہے کل کی بات کہ جلتا ہوا دیا تھا میں
دہکتی آگ پہ ہر شب دھمال ڈالتا تھا
نہ جانے کس کی محبت میں مبتلا تھا میں
دیے جلائے، دُعائیں پڑھیں، روانہ ہوا
ذرا سی دیر میں پانی پہ چل رہا تھا میں
نہ جانے کون مری ڈور کھینچتا تھا نوید
نہ جانے کس کے اشاروں پہ ناچتا تھا میں

نوید حیدر ہاشمی

دستار و جاہ و منصب و زر کا خیال کیا
یہ عشق ہے یہاں پہ انا کا سوال کیا
کشکول جب اُٹھا ہی لیا ہاتھ میں تو پھر
دل میں خیالِ عزتِ دستِ سوال کیا
تم نے بھی اپنے ہاتھ میں پتھر اُٹھا لیے
تم کو بھی دوستی کا نہ آیا خیال کیا
ہم کشتگانِ عشق جدھر بھی نکل پڑیں
یہ شرق و غرب کیا، یہ جنوب و شمال کیا
گاتے ہیں اس کے گیت سبھی لوگ شہر کے
اُس چشمِ نغمہ گر نے کیا ہے کمال کیا
چہروں پہ گردِ دشتِ تمنا جمی ہوئی
خواہش نے آدمی کو کیا پائمال کیا
لوگوں نے میری سلطنتِ دل سنبھال کی
بازو و دست میں مرے آیا زوال کیا
ہر کوزہ گر طلسمِ ہوائے خیال ہے
مانی و ہتان سین کیا، انور جمال کیا

انور جمال

کومل لڑکی سچ مچ کومل پاگل سی شرمیلی سی
دروازے پر ہاتھ ہلائے اک ماچس کی تیلی سی
جگنو اُس کو دیکھنے آئے اور تتلی ماتھا چومے
روپ کی دھوپ میں خوب بنائے صندل سی چمکیلی سی
چاند بھی اُس کے نخرے جھیلے کلیاں بھی شرما جائیں
ہاتھ میں ایک ہی چوڑی پہنے وہ بھی بالکل ڈھیلی سی
دل کی زمیں پر کھلنے لگ جاتے ہیں نیلے پیلے پھول
پیڑ کے پیچھے چھپ کر دیکھے جب وہ چھیل چھبیلی سی
سانسیں رُکنے لگ جاتی ہیں اور پھر ہوش نہیں رہتا
سامنے میرے جب آ جائیں اُس کی آنکھیں نیلی سی
کیا ہے آخر کیوں ہے تمہارا چہرہ اُترا اُترا سا
کچھ تو بولو کس نے ڈانٹا کیوں رنگت ہے پیلی سی
گاؤں کا منظر ندیا، پیپل، شام، جدائی کا لمحہ
اور اب اکثر یاد آتی ہیں اُس کی پلکیں گیلی سی

راؤ وحید اسعد

میں جا رہا تھا تو میرا جہان رونے لگا
لپٹ کے صحن سے سارا مکان رونے لگا
ہمارے ملنے کا لمحہ بھی اب بچھڑتے وقت
تمہارے اور میرے درمیان رونے لگا
مرا پڑاؤ نہیں ان کی دسترس میں اب
بچھڑ کے مجھ سے مرا ہر نشان رونے لگا
نہال بھوک سے مر جائیں مفلسوں کے یہاں
یہ سوچ کر ہی مرا تو گمان رونے لگا
سڑک کے نقشے میں دیکھا تو باغ تھا ہی نہیں
لپٹ کے باغ سے پھر باغبان رونے لگا
میں کر رہا تھا خلاؤں میں جب بسیرا راج
زمین رونے لگی آسمان رونے لگا

رئیس راج

دل کو جگنو بنا کے بھیجوں گا
چاند تم تک ضرور پہنچوں گا
گھر کی دہلیز روک مت مجھ کو
میرا وعدہ ہے جلد لوٹوں گا
چاہتا ہوں وہ سامنے بیٹھے
جانتا ہوں میں کچھ نہ بولوں گا
خواب میں آ گیا جو ماہِ تمام
اپنی مرضی سے پھر میں جاگوں گا
تیری جانب میں چل پڑا ہوں اب
سانس ٹھہرا تو پھر میں ٹھہروں گا
اُس نے آنا ہے آ گیا تو پھر
میں خوشی سے تو مر ہی جاؤں گا
اُن کے دل میں بھی جا کے بس جانا
اے محبت تجھے دُعا دوں گا
ساتھ چلنے دو ہم سفر بن کر
شمس ہوں روشنی بکھیروں گا

زاہد محمود شمس

کسی کا بوجھ اُٹھاتے ہوئے لرزتا ہوں
میں کارِ خیر کماتے ہوئے لرزتا ہوں
ترے جہانِ تماشا کی پائمالی کے بعد
میں کوئی شہر بساتے ہوئے لرزتا ہوں
یہ ایک دل ہی تو ہے میرا آخری ہمدرد
اسے بھی حال سناتے ہوئے لرزتا ہوں
نجانے کون ہے میرا ہدف نہیں معلوم
میں اپنے سامنے جاتے ہوئے لرزتا ہوں
غروب ہوتے ہوئے مہر و ماہ جانتے ہیں
میں کیوں چراغ جلاتے ہوئے لرزتا ہوں
بھڑک اُٹھوں نہ میں اپنے نواح میں شہزاد
لہو میں آگ جلاتے ہوئے لرزتا ہوں

قمر رضا شہزاد

میں بھی ثروت کی پیروی کر لوں
جی میں آتا ہے خودکشی کر لوں
موت کی بارگاہ میں جاؤں
اپنے ہونے کو دائمی کر لوں
قبر کھودوں میں جا کے جنگل میں
اور وہاں خود کو دفن ہی کر لوں
جا کے بیٹھوں میں دشت کے اندر
خود کو دنیا سے اجنبی کر لوں

مبشر سعید

فیصل آباد

چھوڑ دیتا ہوں میں جب روز پرندے گھر سے
رُوٹھ جاتے ہیں مرے پھول سے بچے گھر سے
پیار دیتا ہے ترا ایسے صدائیں مجھ کو
جس طرح آتی ہو آواز پرانے گھر سے
"میں ہوں سائل" کی صدا جب بھی لگائی در پہ
میں نے دیکھا کہ مرے یار نہ نکلے گھر سے
جا کے پردیس میں بے یار و مددگار ہیں وہ
جو گئے تھے کئی لے کے حسیں سپنے گھر سے
یار لوگوں نے مجھے جھوٹ سکھایا انور
میں تو سمجھا تھا کہ ہیں یار بھی سچے گھر سے

انور ندیم

دل دنیا کا باسی ہوں
تنہائی کا عادی ہوں
جس کو مجھ پر ہونا تھا
میں اُس خوف پہ طاری ہوں
ڈوبنے والے سورج کی
مدھم پڑتی لالی ہوں
مری اُڑان خیالی ہے
میں کاغذ کا پنچھی ہوں
اُس کا کیا اقرار کروں
خود سے بھی انکاری ہوں
میں اپنے ہی رستے کا
پتھر ہوں اور بھاری ہوں

بات اتنی ہے جعفر جی
جتنا کچھ ہوں کافی ہوں

جعفر حسن مبارک

عطا کے زورِ اثر سے بھی ٹوٹ سکتی تھی
کہ شاخ بارِ ثمر سے بھی ٹوٹ سکتی تھی
میں دل میں اس کی نمو سے تھا خوف کھایا ہوا
جو سیپ تابِ گہر سے بھی ٹوٹ سکتی تھی
جڑے ہوئے تھے بڑے وسوسے خیالوں سے
سو نیند خواب کے شر سے بھی ٹوٹ سکتی تھی
دلوں کی شیشہ گری کارگاہِ ہستی میں
ہنر کی زیر و زبر سے بھی ٹوٹ سکتی تھی
اگر زمیں نہ دکھاتی کمال یہ اپنا
قیامت آسماں پر سے بھی ٹوٹ سکتی تھی

خاور جیلانی

رگ رگ میں اُترتا ہے اک زہر ہمیشہ
پلکوں سے اُلجھتی رہے اک لہر ہمیشہ
مٹھی سے پھسل جاتا ہے وہ ریت کی مانند
اوروں پہ مہرباں ہے وہ بے مہر ہمیشہ
مجھ سے ہیں گریزاں مرے دوست کچھ ایسے
اور لہجے بدلتے ہیں میرے شہر ہمیشہ
ہر روز اذیت کی ضرب دل پہ لگے ہے
بارود میں لپٹا ہے کوئی قہر ہمیشہ
لپٹے ہوئے ہیں مجھ سے امربیل کی صورت
سوچوں کے شجر پر یہ غم و دہر ہمیشہ
کانوں میں صدا آتی تھی جب پیار سے ماں کی
جاگ اُٹھتی ہوں میں رات کے اس پہر ہمیشہ
خودکش میرے کس شہر میں کب کس کو جلا دیں
یہ خوف میرے دل میں گیا ٹھہر ہمیشہ
گلفام میرے سپنوں میں اب تک بھی رواں ہے
گاؤں سے گزرتی ہوئی اک نہر ہمیشہ

گلفام نقوی

کبھی فردا سے خوف آیا، کبھی ماضی کا دُکھ چھایا
مجھے تو لمحۂ موجود بھی نصرت نہ راس آیا
تو پھر کیا ہو گیا میں آنسوؤں سے کام لے لوں گا
مری کشتِ تمنا پر اگر بادل نہیں چھایا
فروغِ ظلمتِ شب کا سفر ہے دیکھنا یہ ہے
کہاں تک ساتھ دیتا ہے تمہاری یاد کا سایا
کسی دامن کو بھر دیتا کسی کے کام آ جاتا
یہ میرے آنسوؤں کا قیمتی بے کار سرمایا
اندھیروں پر بھی ہم نے سو طرح سے نقطہ چینی کی
اُجالوں کو بھی اکثر موردِ الزام ٹھہرایا
مری آنکھوں میں سکوں کی طرح آنسو ڈھلے نصرت
مرے آگے کسی مفلس نے جب بھی ہاتھ پھیلایا

نصرت صدیقی

ماہنامہ ارژنگ لاہور
جنوری 2015ء

حسن عباسی

بھارت یاترا

جشن ادب اور پاسبان ادب کے زیر اہتمام ممبئی اور دہلی کے مشاعروں کا احوال

مسقط میں چند روز

''ایک شام عطاء الحق قاسمی کے نام''

الفا ایونٹس (عمان) کی یادگار محفل مشاعرہ

گزشتہ چند برسوں سے متحدہ عرب امارات، دوحہ، بحرین، کویت اور مسقط میں ادبی و ثقافتی سرگرمیاں عروج پر نظر آتی ہیں۔ آئے دن ادیبوں، شاعروں، فن کاروں، گلوکاروں، موسیقاروں اور ڈرامہ آرٹسٹوں کو وہاں تقریبات میں بلایا جاتا ہے اور اُن کی بھرپور پذیرائی کی جاتی ہے۔ کچھ عرصہ قبل مسقط میں بھی ایک یادگار تقریب کا اہتمام الفا ایونٹس نے کیا۔ نامور کالم نویس، مزاح نگار، ڈرامہ رائٹر، سفرنامہ نگار اور شاعر عطاء الحق قاسمی کے اعزاز میں یہ تقریب سجائی گئی اور اسے An Evening with Ata ul Haq Qasmi کا نام دیا گیا۔ تقریب دو حصوں پر مشتمل تھی۔ پہلا حصہ صاحب شام کی فن و شخصیت کے حوالے سے گفتگو اور دوسرا حصہ محفل مشاعرہ پر مشتمل تھا۔ سوشل کلب لٹریری وِنگ عمان کے جنرل سیکرٹری اور خوبصورت شاعر قمر ریاض کی دعوت پر راقم نے اس تقریب میں شرکت کی۔ عمان تین دہائیاں قبل جلتے ہوئے صحرا کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ پھر وقت نے کروٹ بدلی اور آج تیل کے ذخائر کی بدولت دیگر عرب ممالک کی طرح اس ملک نے بھی حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ سلطان القابوس کی حکومت نے ملکی ترقی اور عوام کی خوشحالی کے لیے انقلابی اقدامات کیے جس کے ثمرات اب ہر شعبہ زندگی میں نظر آتے ہیں۔ تاہم ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ کیونکہ عمان گلف کے دیگر ممالک کے مقابلے میں ترقی کی دوڑ میں ابھی پیچھے ہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ رعایا سلطان سے خوش بہت ہیں اور ہر وقت اس کے لیے دعا گو رہتے ہیں۔ مسقط میں بسلسلہ روزگار پاکستان اور ہندوستان کے لوگ لاکھوں کی تعداد میں مقیم ہیں۔ اُن کے لیے ادبی اور ثقافتی تقریبات غنیمت ہوتی ہیں اس لیے وہ بڑے ذوق وشوق سے ان میں شرکت کرتے ہیں۔ محفل مشاعرہ میں بھی لوگوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ عمان میں پاکستان کے سفیر سید ایاز حسین نے تقریب کی صدارت کی۔ جبکہ مہمانِ خصوصی عطاء الحق قاسمی تھے۔ مہمانانِ اعزاز میں راقم کے علاوہ عشرت آفرین (امریکہ)، فیاض شاہ، احسان شاہد چوہدری (UK) تھے۔ نظامت کے فرائض قمر ریاض نے ادا کیے۔ تقریب کے پہلے حصے میں عطاء الحق قاسمی کی فن و شخصیت کے حوالے سے مضامین پڑھے گئے۔ یو کے سے تشریف لائے ادیب احسان شاہد کے مضمون کو بہت پسند کیا گیا۔ راقم اور چند دیگر مقامی شعراء نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ عطاء الحق قاسمی نے اپنے روایتی انداز میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے محفل کو کشت زعفران بنا دیا۔ سید ایاز حسین نے

عشرت آفرین، عطاء الحق قاسمی، سید ایاز حسین (سفیر)، حسن عباسی، سید فیاض شاہ اور قمر ریاض

عطاء الحق قاسمی

سید ایاز حسین (سفیر)

احسان شاہد

عشرت آفرین

بھی صاحب شام عطاء الحق قاسمی کی علمی وادبی کاوشوں کو سراہتے ہوئے ان کے وجود کو اردو ادب کے لیے غنیمت قرار دیا۔ محفل مشاعرہ میں مقامی شعراء قمر ریاض، ناصر معروف، مروّت احمد، ذاکر حسین ذاکر، علی محمد فضل، فہیم ضیاء اور عذرا علیم نے اپنا کلام پیش کیا۔ مہمانوں میں راقم کے علاوہ احسان شاہد، چوہدری (یوکے) عشرت آفرین (امریکہ) اور عطاء الحق قاسمی نے اپنی دل پذیر شاعری کے ذریعے حاضرین کے دل جیت لیے اور ڈھیروں داد سمیٹی۔ آخر میں عمان میں پاکستان کے سفیر سید ایاز حسین نے شعراء اور سوشل کلب عمان کے عہدیداروں کو یادگاری شیلڈز دیں۔ مشاعرہ کے بعد بہت سے انڈین اور پاکستانی کمیونٹی کے افراد نے راقم سے ملاقات کی اور شاعری کو سراہا۔ تصاویر اور آٹو گراف کے سلسلے کے ساتھ یہ شام بھی زندگی کی چند خوبصورت شاموں کی طرح یادوں کے بہت سے جلتے چراغ دل ودماغ میں روشن کر کے چلی گئی۔ مسقط میں ایک نکاح کی تقریب میں بھی شرکت کا موقع ملا۔ عمان میں بڑی مساجد کے ساتھ ایک ہال ہوتا ہے جہاں نکاح کی تقریب ہوتی ہے۔ دیوار کے ساتھ منسلک نشستوں پر سب مہمان بیٹھ جاتے ہیں چند نوجوان کھجور اور قہوے سے مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں اس دوران نکاح پڑھا دیا جاتا ہے۔ بعد میں پانچ پانچ کی ٹولیوں میں افراد فرشی نشست پر دسترخوان بچھا لیتے ہیں۔ دیگر عرب ممالک کی طرح مسقط کے باشندے بھی اپنے کلچر اور لباس کو بڑی اہمیت دیتے ہیں عربی لباس زیب تن کیے ہاتھ میں چھڑی لیے تقریبات میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں پاکستانی اور عمانی افراد کی شرکت سے دونوں کمیونٹی کے گہرے روابط کا بھی پتہ چلتا تھا۔ محفل مشاعرہ سے اگلے روز سوشل کلب عمان کے زیر اہتمام قوالی کی تقریب منعقد ہوئی جس میں پاکستان سے بدر علی میاں داد قوال اور اُن کے ہم نواؤں نے خوب رنگ جمایا۔ اس تقریب کی خاص بات پاکستان، افغانستان اور انڈیا کے سفیروں کی شرکت تھی۔ عطاء الحق قاسمی اور راقم بھی بطور خاص اس تقریب میں مدعو تھے۔ مسقط کے مہنگے ترین اور دل فریب ہوٹل Caves (الکھف) میں ڈنر بھی بہت یادگار تھا۔ ایک پہاڑ کو کاٹ کر خوبصورت ہوٹل کا روپ دیا گیا ہے جس کے چاروں طرف اور غاروں کے اندر ڈائننگ ہال ہیں۔ یہ دُنیا کے چند خوبصورت ہوٹلوں میں سے ایک ہے۔ عمان میں پاکستان کے سفیر سید ایاز حسین نے مہمان شعراء اور مقامی ادیبوں کے اعزاز میں ایک ڈنر کا اہتمام اپنے گھر پر کیا۔ بلاشبہ وہ ایک درویش صفت انسان اور بہت اچھے میزبان ہیں۔ عطاء الحق قاسمی کی رفاقت محبت اور شفقت کے سایہ سایہ یہ سفر میری زندگی کا یادگار سفر تھا۔ میزبانوں قمر ریاض ناصر معروف اور مروت احمد کی محبتیں ناقابل فراموش ہیں۔

حسن عباسی

مروت احمد

قمر ریاض

ناصر معروف

ممبئی اور دہلی کے مشاعروں کا احوال

بھارت میں مشاعروں کی روایت بہت مضبوط اور توانا ہے۔ ان مشاعروں میں انڈیا کے علاوہ دیگر ممالک سے بھی شعراء کو مدعو کیا جاتا ہے۔ خاص کر پاکستان کے شعراء اپنی دل پذیر شاعری کے باعث ہمیشہ وہاں مقبول رہے ہیں۔

ممبئی اور دہلی میں عظیم الشان مشاعرے منعقد ہوئے جن میں پاکستان سے کشور ناہید، شعیب بن عزیز، فاضل جمیلی، رحمٰن فارس اور راقم کو مدعو کیا گیا تھا۔ شعیب بن عزیز اور فاضل جمیلی اپنی مصروفیت کے باعث ان مشاعروں میں شریک نہ ہو سکے۔ ویزے تاخیر سے ملنے کے باعث ہم نے سولہ اگست کو سرحد پار کی اور اسی تاریخ کو ممبئی میں مشاعرہ تھا۔ امرتسر میں لنچ کرنے کا ہی موقع مل سکا۔ بذریعہ ہوائی جہاز ہم ممبئی پہنچے تو شام کے سات بج رہے تھے۔ یہ مشاعرہ پاسبانِ ادب کے زیرِ اہتمام انعقاد پذیر تھا جس میں پاکستان اور قطر کے علاوہ بھارت کے مختلف صوبوں سے نامور شعراء شریک تھے۔ جب ہم ہال میں پہنچے تو سامعین کی تعداد، اسٹیج کی سجاوٹ، فلیش بیک اور مختلف رنگوں کی جگ مگ کرتی روشنیوں سے یوں لگا جیسے بالی ووڈ کی کسی تقریب ایوارڈ میں آ گئے ہیں۔ مگر جب ہمارے ناموں کے ساتھ خوش آمدید کہا گیا اور اسٹیج پر بلایا گیا تو یقین آ گیا کہ مشاعرے میں ہی ہیں۔ پاسبانِ ادب کے روح و رواں قیصر خالد ہیں جو کہ نوجوان شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ممبئی کے ایڈیشنل کمشنر پولیس ہیں۔ اس مشاعرے کی نظامت بھی وہی کر رہے تھے۔ کسی بھی شاعر کو دعوتِ کلام دینے سے قبل سکرین پر اُس کا مکمل تعارف پیش کیا جاتا۔ ایک یا دو غزلیں سنانے والی پابندی بھی نہیں تھی۔ سو شخصی اور تخلیقی حوالے سے شاعر کا بھرپور تعارف سامعین سے ہو پاتا۔ مشاعرہ کشور ناہید صاحبہ کی صدارت میں ہوا۔ حاضرین میں مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات موجود تھیں۔ نامور اداکار نصیر الدین شاہ، بین الاقوامی شہرت یافتہ قوال حاجی مجید شعلہ اور اُستاد غلام مصطفیٰ کے علاوہ منسٹرز بھی شریک تھے۔ مگر یہ بات قابل ستائش ہے کہ شعراء کے علاوہ کسی اور شخصیت کو اسٹیج پر براجمان ہونے کا موقع فراہم نہیں کیا گیا۔ حاضرین کی کثیر تعداد نے ہر اچھے شعر پر دل کھول کر داد دی۔ اس مشاعرے میں راقم کے علاوہ فرحت احساس، اطہر شکیل، خوشبیر سنگھ شاد، کلیم ثمر، رحمٰن فارس، ڈاکٹر شبنم عشائی، ترنم ریاض، بھانج کمار بھانج، عبیداللہ عزمی اور سدھارتھ شاندیلہ نے اپنا کلام سنایا۔ مشاعرہ ۱۲ بجے رات تک جاری رہا۔ اُس کے بعد پرتکلف ڈِنر کا اہتمام تھا۔ صبح ہماری فلائٹ دہلی کے لیے آٹھ بجے تھی۔ ہماری اس بھارت یاترا کے میزبان معروف ادبی تنظیم جشن ادب (دہلی) کے بانی و سرپرست رنجیت چوہان تھے۔ گزشتہ کچھ برسوں سے وہ بڑے کامیاب مشاعروں کا انعقاد کر رہے ہیں۔ وہ نہ صرف خوبصورت شاعر ہیں بلکہ بہترین منتظم بھی ہیں۔ خوش آئند بات یہ تھی کہ اس سفر میں وہ ہمارے ساتھ تھے۔ دہلی میں کچھ آرام اور کچھ طعام کے بعد نیشنل سینٹر میں مشاعرہ تھا۔

دہلی میں پاکستان کے ہائی کمشنر عبدالباسط، کشور ناہید، حسن عباسی اور دیگر مہمانان اعزاز

نصیر الدین شاہ، خالد قیصر، کشور ناہید اور حسن عباسی ممبئی پوئٹری فیسٹول 2014ء

حسن عباسی پاسبان ادب کے زیر اہتمام ممبئی مشاعرے میں

حسن عباسی اور اطہر شکیل

اس مشاعرے کی صدارت بھی کشور ناہید صاحبہ نے کی۔ جبکہ مہمانِ خصوصی ہائی کمشنر آف پاکستان عبدالباسط تھے جو کہ خود شاعر ہیں اور انھوں نے اس مشاعرے میں اپنا کلام بھی سنایا۔ یہاں بھی اسٹیج پر صرف شعرائے کرام ہی جلوہ افروز تھے۔ پاکستان سے آئے ہوئے نوجوان شاعر رحمٰن فارس کو نظامت سونپ کر جشن ادب نے ایک نئی روایت کا آغاز کیا۔ یہاں بھی دہلی کے باذوق اور معتبر شخصیات کو مدعو کیا گیا تھا جنہوں نے بھرپور داد کے ذریعے مشاعرے کا لطف دوبالا کر دیا۔ اس مشاعرے میں بھی راقم کے علاوہ رنجیت چوہان، خوشبیر سنگھ شاد، پراگ اگروال، وشال کے وکاس اور ڈاکٹر شبنم عشائی نے اپنا کلام پیش کیا۔ کشور ناہید صاحبہ نے خطبہ صدارت میں امن اور محبت کی بات کی اور اپنی مشہور زمانہ نظم ''وہ جو بچیوں سے بھی ڈر گئے'' سنائی اور ڈھیروں داد وصول کی۔ اس نظم کے علاوہ بھی حاضرین کی فرمائش پر انھوں نے اپنا بہت سا کلام سنایا۔ دونوں ملکوں کے شعراء کی شاعری اپنے دامن میں امن اور محبت کا پیغام لیے ہوئے تھی۔ مشاعرے کے بعد کچھ لوگ ایسے بھی ملے جو کہ میرے فیس بک فرینڈز تھے جن میں پرویز شہر یار اور نینا کماری کے نام اہم ہیں۔ پرویز شہر یار نقاد اور افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے مجھے اپنی افسانوں کی کتاب بھی پیش کی۔ نینا کماری خوبصورت شاعرہ ہیں اور کسٹم میں کمشنر ہیں۔ رنجیت چوہان کی دل پذیر شخصیت، شاعری اور میزبانی نے مختصر بھارت یاترا کو بھی خوبصورت یادوں سے آباد کر دیا۔

دہلی میں جشن ادب کے مشاعرے سے قبل میزبان رنجیت چوہان مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے۔

کشور ناہید صاحبہ کی رفاقت نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ ہم پردیس میں ہیں۔ پاکستان کی طرح بھارت میں بھی اُن سے محبت کرنے والوں کی تعداد بہت ہے۔ میں نے دس ممالک کے عالمی مشاعروں میں شرکت کی ہے۔ بلاشبہ یہ دو مشاعرے میری زندگی کے سب سے خوبصورت اور یادگار مشاعرے تھے۔ اُمید ہے دونوں ممالک جلد دوستی کی ایسی شاہراہ پر گامزن ہوں گے جس کی منزل امن اور محبت ہوگی۔ یہی دنیا بھر کے شاعروں کا خواب اور پیغام ہے۔

مبارک باد

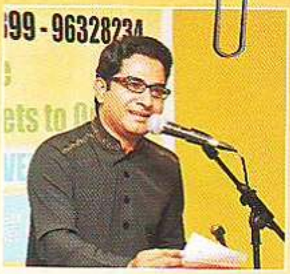

ادارہ ''ارژنگ'' لٹریری سوشل کلب عمان کے عہدے داروں مروت احمد، قمر ریاض اور ناصر معروف کو مسقط میں مسلسل یادگار عالمی ادبی تقریبات منعقد کرنے پر مبارک باد پیش کرتا ہے

عامر بن علی

حسن عباسی

نازاو کاڑوی

ساہیوال

کبھی ہوا کبھی ابرِ رواں کے ساتھ چلوں
کہ سب مناظرِ فطرت سپردِ خامہ کروں
اُتاروں آنکھ میں حیرت کے اس تسلسل کو
میں شش جہات میں اُڑتا ہوا پرندہ ہوں
کپاس چنتی ہوئی لڑکیوں کی قسمت میں
لکھا ہے کس نے سلگتے ہوئے وسے کا فسوں
نجانے کس کے بدن سے ست کے آیا ہے
ٹپک رہا ہے جو چلتی ہوئی مشین سے خوں
یہ پتھروں سے لڑھکتے ہوئے حسیں چشمے
جو فرقِ سنگ دلاں پر بہیں تو پھر جانوں
وہ اپنے حسن کے پرتو کی اوٹ میں ہے کہیں
میں جس کے نام کی تسبیح دھڑکنوں میں سنوں
اسی کی دین ہیں ایزد یہ سب گلاب غزل
مجھے ہے اذن کہ شاخِ خیال سے چن لوں

ایزد عزیز

اے خوشا! سردی موسم کی وہ ہجرت مجھ میں
آ بسی سارے زمانوں کی ہے وسعت مجھ میں
شکر صد شکر کھلا بابِ قناعت مجھ میں
کی بھی برپا ہوسِ زر نے قیامت مجھ میں
پا برہنہ، حرمِ شوق کا جاری ہے طواف
ختم ہوتی ہی نہیں ایک مسافت مجھ میں
پہلے رکھا گیا اک بوجھ مرے کاندھوں پر
پھر اُتاری گئی افلاک کی رفعت مجھ میں
اُس کی خلاقی و قدرت کی نشانی ہی تو ہے
دم بہ دم رنگ بدلتی ہوئی حیرت مجھ میں
اُس کی آیات پہ قربان مری ہر دھڑکن
جاری رہتی ہے مناظر کی تلاوت مجھ میں
چمک اُٹھتا ہے عطا خوف بھری راتوں میں
جاوداں اسم، کسی چاند کی صورت مجھ میں

عطاءالرحمٰن قاضی

کھلے گلوں سے شکستہ دلوں سے واقف تھا
میں زندگی کے سبھی پہلوؤں سے واقف تھا
کچھ اس لیے بھی کیا اُس نے مجھ پہ وار شدید
مرا حریف مرے حوصلوں سے واقف تھا
بھٹک کے رہ گیا دل کی غلام گردش میں
جو زندگی کے سبھی راستوں سے واقف تھا
میں ڈوب کر بھی رہا مطمئن کہ موج بہ موج
بگڑتے بنتے ہوئے دائروں سے واقف تھا
بچھڑ گیا تو کبھی پھر مجھے ملا ہی نہیں
بچھڑنے والا مری عادتوں سے واقف تھا
ہوا تو خیر ازل سے مری مخالف تھی
خدایا! تُو تو مری نیتوں سے واقف تھا
مرے غموں سے غضنفر وہ بے خبر ہی سہی
چراغِ شب تو مری وحشتوں سے واقف تھا

غضنفر عباس سیّد

ماں کے حوالے سے اشعار

ماں کی جدائی بھی مجھے تنہا نہ کر سکی
اشکوں کا اک ہجوم مرے ساتھ ساتھ ہے

ماں جب سے تو چھوڑ کر گئی ہے
دل غم سے نڈھال ہو گیا ہے

اس کی آواز بھی نہیں آتی
ماں بہت دور جا چکی شاید

گو چلی گئی ہے ماں پھر بھی دل یہ کہتا ہے
سلسلہ دعاؤں کا ختم ہو نہیں سکتا

ماں ترے ہجر میں مری آنکھیں
رات دن اشکبار رہتی ہیں

ماں ترے بعد دل پہ جو گزری
کس کو وہ داستاں سناؤں میں

ماں ترے جانے سے غم ایسے مجھے راس آیا
اب خوشی پاس سے گزرے بھی تو ڈر جاتا ہوں

ماں کے کمرے میں بیٹھ کر تنہا
خامشی سے کلام کرتا ہوں

تاکہ اولاد کی بخشش کا سبب بن جائے
ماں کو اس واسطے دنیا میں خدا بھیجتا ہے

چاپ سنتے ہی ترے قدموں کی
نیند میں اُٹھ کے بیٹھ جاتا ہوں

چھوڑ کر ماں چلی گئی جب سے
غم کی تصویر بن گیا ہوں میں

علی رضا

تخیلات کی حیرت سرا میں پھول کھلے
کسی کا نام لیا اور ہوا میں پھول کھلے
عجیب وصل کے لمحات تھے کہ ملتے ہی
کسی کے دل کسی کی قبا میں پھول کھلے
قبولیت کے عمل کا مزہ تو جب ہے میاں
کہ ہاتھ اُٹھنے سے پہلے دعا میں پھول کھلے
ٹھہر ٹھہر کے کسی نے مری طرف دیکھا
ٹھہر ٹھہر کے دلِ مبتلا میں پھول کھلے
شروعِ عشق میں ہوتی ہے خوشبوؤں کی طلب
میں کیا کروں گا اگر انتہا میں پھول کھلے
سب اپنے اپنے نشے میں بڑے سکون سے ہیں
خمار خانۂ خلقِ خدا میں پھول کھلے

اعجاز توکل

اگر منزل سے کچھ پہلے ترا دیدار ہو جائے
ہمارے راستوں کی دُھول تک گلنار ہو جائے
سمجھ لینا کسی کا ہاتھ ہوگا میرے شانے پر
اگر کاغذ کی ناؤ سے سمندر پار ہو جائے
مجھے اس شہر کی آب و ہوا سے خوف آتا ہے
جہاں چاک گریباں صاحب دستار ہو جائے
پریشانی کی اس اُٹھتی ہوئی دیوار میں جو بھی
سکوں کا اک دریچہ وا کرے فنکار ہو جائے
شرارت سے بھری اب میرے بچپن کی کہانی پر
کسی اُڑتے غبارے کا بھی کچھ اظہار ہو جائے
بھرم رہ جائے گا کچھ شاعری کے استعاروں کا
اگر آکاش کا سورج ترا رُخسار ہو جائے
ذمہ داری کا آدھا بوجھ کم پڑ جائے تو راکبؔ
ہماری شاعری کا اور ہی معیار ہو جائے

سجاد راکبؔ

پھولوں جیسے پیراہن میں چمکیلے بھڑکیلے لوگ
تیرے شہر میں آ کر دیکھے کتنے رنگ رنگیلے لوگ
درد لپٹ کر چہروں سے سب رنگ اُڑا لے جاتا ہے
جھونپڑیوں میں کب ہوتے ہیں سنورے اور چھبیلے لوگ
نفرت چوٹ پہ ڈنکے کی، اور ظلم بہ بانگ دہل کریں
چاہت کے اظہار پہ اکثر بن بیٹھیں شرمیلے لوگ
بلی کے رستہ کاٹے پر بیٹھ گئے ہم سے کاہل
دیواروں کو پھاند کے نکلے چست، جواں، پھرتیلے لوگ
اوّل اوّل ریشم سا من، موم کلیجہ رکھتے تھے
آخر آخر کر بیٹھے ہیں اپنے دل پتھریلے لوگ
ہا ہوں کے شور میں میٹھے بول کو ترسے کان یہاں
میرے چاروں اور بسے ہیں کڑوے ترش کسیلے لوگ

عاصم ثقلین درانی

جدائی موت ہے میں نے تمھیں کہا تھا نا
بچھڑتے وقت یہ محسوس ہو رہا تھا نا
تم ایک پیڑ ہو اپنی جگہ پہ رہتے ہو
میں جا رہا ہوں بھٹکتی ہوئی ہوا تھا نا
چھپائے پھرتے تھے لوگوں سے لال آنکھوں کو
شروعِ عشق تھا اور پہلا رتجگا تھا نا
دھویں کی لاش ہوا نے اُٹھائی کاندھوں پر
اسی ہوا سے دیا رات بھر لڑا تھا نا
اسی لیے مری آنکھوں پہ آنکھ رکھی گئی
میں جاگتے ہوئے بھی خواب دیکھتا تھا نا
بہار میں بھی جو عاطفؔ ہرا نہیں ہوتا
ہمارا نام اسی پیڑ پر لکھا تھا نا

عاطف نصیر

ہوتے ہوتے بات اَدھوری رہ جاتی ہے
آنکھوں کی سوغات ادھوری رہ جاتی ہے
میری عید کیسی تلخ اگر ہوتی ہے
اس کی بھی شب رات ادھوری رہ جاتی ہے
کانٹوں کی بھی شان ہے اپنی بن کانٹوں کے
پھولوں کی اوقات ادھوری رہ جاتی ہے
جب تک اس میں میرے آنسو شامل نا ہوں
ساون کی برسات ادھوری رہ جاتی ہے

مشتاق تنویر/خیرپور ٹامے والی

ہمیشہ بند رہا اُس کے گھر کا دروازہ
جو اتفاق سے میری گلی میں کھلتا تھا

صاحبزادہ ریاض احمد رحمانی/خیرپور ٹامے والی

غزلیات

زخم سینے کا سیا جائے اگر
زہرِ غم بھی پی لیا جائے اگر
کوئی جینے کا نہیں ساماں اب
کیا جیا جائے جیا جائے اگر
یہ بھلا کیسے کوئی جرم ہوا؟
درد اپنوں کو دیا جائے اگر
کیا لیا جائے؟ نہیں کچھ معلوم
نام اب اُس کا لیا جائے اگر
درد کیا اور نہیں بڑھ جاتا
خالی محسوس کیا جائے اگر

خالد فیاض خالی

اُس کا بھی غم بہت اب معدوم ہو چکا ہے
وہ خوش ہے کھو کے ہم کو معلوم ہو چکا ہے
ہر سوچ میں وہ میری کچھ ایسے بس گیا ہے
ہر فعل میرا اس سے موسوم ہو چکا ہے
کیا بات ہو گئی ہے بادل نہیں برستا
وہ حال پر تو میرے مغموم ہو چکا ہے
رہتا ہے وہ نظر میں چاہے کہیں بھی جائے
آنکھوں میں ایک چہرہ مرقوم ہو چکا ہے
اک بار لوگ پھر سے دیوانے ہو رہے ہیں
کہتے ہیں وہ دوبارہ معصوم ہو چکا ہے
ہر شخص کہہ رہا ہے میرا اُداس چہرہ
اس بے وفا کے غم کا مفہوم ہو چکا ہے

جو زندگی کے سارے دکھ درد بانٹتا تھا
اُس سائے سے صفی اب محروم ہو چکا ہے

عتیق الرحمٰن صفی

مری خموش طبیعت کو گفتگو کے لیے
کوئی تو شخص ملے حرفِ آرزو کے لیے
کسی نے زیست کمانے کو بیچ دی غیرت
کسی نے جان لٹا دی ہے آبرو کے لیے
بھڑکتی ہے تو ہی دیتی ہے نارِ عشق مزہ
سو پیٹتا ہوں جگر، گرمیٔ لہو کے لیے
زمانہ کچھ بھی کہے، لیکن اے دلِ خودسر
ہم اپنا آپ بدل لیں گے ان کی خو کے لیے
یہ کائنات کی رونق، مرے ہی دم سے نہیں
ترا وجود بھی لازم ہے رنگ و بو کے لیے
ہمارے بس میں نہیں اس کو ڈھونڈنا لیکن
لہو میں شوق اُچھلتا ہے جستجو کے لیے
سخن میں اس لیے تکمیلِ فن کے حق میں نہیں
کہ عیب کچھ تو رہے، مجھ میں عیب جُو کے لیے

علی جان سخن

لاکھ کر کے بہانے دیکھ لیا
میں نے تجھ کو زمانے دیکھ لیا
نامہ بر کہنا اب نہ دیر کرے
گھر کو میرے فضا نے دیکھ لیا
دیپ چاہت کا بجھنے والا نہیں
گھوم پھر کے ہوا نے دیکھ لیا
ٹھوکریں کھا کے لوٹی گھر میرے
شہر سارا وفا نے دیکھ لیا
تب سے عشقِ بتاں کو چھوڑ دیا
جب سے ساجد خدا نے دیکھ لیا

لطیف ساجد

ہر شام ان سے ملنے کی عادت سی ہو گئی
شاید کہ مجھ کو اُن سے محبت سی ہو گئی
آنکھوں میں اُن کی خاص محبت کا نور تھا
مجھ کو وہ آنکھیں پڑھنے کی عادت سی ہو گئی
اُن کی نظر نے پیار کے قابل سمجھ لیا
مجھ پر مرے خدا کی عنایت سی ہو گئی
اُس کے بنا یہ زیست ادھوری لگے مجھے
وہ ذات جیسے میری ضرورت سی ہو گئی

سمیرا انمول

حمد اور نعت کے ممتاز شاعر
عبدالمجید چٹھہ
کا حمدیہ مجموعہ ''اعتراف''
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے
ناشر: نستعلیق مطبوعات، لاہور

گوجرانوالہ

جہاں شے کوئی جچتی تھی وہیں اس کو سجایا ہے
زمیں کو پاؤں سے باندھا فلک سر پر اُٹھایا ہے
یہ مانا راہ کی شادابیاں بھی خوب ہیں لیکن
مسافر کے لیے سب سے گھنا منزل کا سایا ہے
تمہارا یہ عمل میری ثمر باری کا شاہد ہے
تمہاری خیر ہو تم نے بھی اک پتھر اُٹھایا ہے
ضمانت پھر بھی دیتے ہیں وہ مستقبل میں سائے کی
اگرچہ بڑ کا پودا جان گملے میں اُگایا ہے

جان کاشمیری

گردشِ دوراں سے گھبرایا ہوا
لگ رہا ہے وہ بھی پتھرایا ہوا
کچھ نہیں اب اس دلِ مفلس کے پاس
چند یادیں اس کا سرمایا ہوا
وہ ہوا جو بن میں رُسوا اس قدر
پھر رہا ہے خود سے شرمایا ہوا
بانٹتا پھرتا ہے کیسے نکہتیں
ایک دل پھولوں کا ٹھکرایا ہوا
وقت کا مارا ہوا سعدیؔ ہے تو
اور وہ جو بن کا گرمایا ہوا

سعید اقبال سعدی (ڈاکٹر)

ترے سپنے سہانے بھول جائیں گے
کہاں موسم پرانے بھول جائیں گے
انہیں تم داستاں میری سنانا تو
وہ خوشیوں کے ترانے بھول جائیں گے
مرے اُجڑے چمن کی بات کرنا تم
گلوں کے کِھل کھلانے بھول جائیں گے
مرے دل کی کہانی تم سنو گے جب
تمہیں اپنے زمانے بھول جائیں گے

صدام ساگر

تجھے دل سے مٹانا ہے ابھی باقی
کوئی طوفان لانا ہے ابھی باقی
مرے پر کاٹ کے بھی وہ کہے جائیں
پرندے کو اُڑانا ہے ابھی باقی
کہاں حسرت، کہاں وہ بے ہنر ساقی
نگاہوں کا پلانا ہے ابھی باقی
مری آنکھیں مجھے جو ڈھونڈنے نکلیں
انہیں بھی ڈھونڈ لانا ہے ابھی باقی
نیا اک زخم تیری تاک میں نکلا
نئی اک چوٹ کھانا ہے ابھی باقی
جسے دیکھیں جلیں یہ آندھیاں عالمؔ
دیا ایسا جلانا ہے ابھی باقی

وسیم عالم

مرے ستاروں کی قسمت میں آسمان کہاں
جھکوں میں جس پہ ترا سنگ آستان کہاں
کھلے ہیں پھول محبت کے خارزاروں میں
محبتوں کے ہیں صحرا میں گلستان کہاں
جو بزمِ غیر میں تیرے لبوں پہ آ جائے
ہو جس میں نام مرا ایسی داستان کہاں
مرے نصیب کے تارے بھی جس میں شامل ہوں
تری جبین فلک پہ وہ کہکشاں کہاں
جوازؔ اُن کی عنایت ہے یاد رکھتے ہیں
وگرنہ ہم ہیں کہاں اُن سے مہربان کہاں

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار

سہ ماہی اُردو مجلّہ ''نوائے ادب''
ایڈیٹر صدام حسین ساگر کے زیرِ اہتمام ملک کے
معروف شاعر ''امین خیال'' (مرحوم)
نمبر چھپ کر منظر عام پر آ گیا ہے جس میں امین خیال مرحوم کی ادبی کاوشوں اور اُن کی شخصیت کے حوالے سے معلومات درج ہیں۔ اس کاوش کے لیے صدام ساگر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ڈونگا بونگا ضلع بہاول نگر کے معروف شاعر
گل زیب عباسی کا نیا افسانوی مجموعہ
''پھول چہرے'' چھپ کر مارکیٹ میں آ گیا ہے
ان کی پنجابی شاعری کی دو کتابوں ''عشق پریتاں'' ہنجواں دے پھل اور افسانوی مجموعہ ''زہریلے پھول'' مختلف تنظیموں سے ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں

شیخو پورہ

مجھ کو شوقِ وصال تھا ہی نہیں
ورنہ ملنا محال تھا ہی نہیں
زندگی آپ ہی گزرتی گئی
میرا کوئی کمال تھا ہی نہیں
عمر بھر کون یاد رکھتا ہے
میں کسی کا سوال تھا ہی نہیں
وہ تو ہم عشق میں ہوئے برباد
ورنہ کوئی وبال تھا ہی نہیں
کیسے ہوتا خراب حال مرا
میرا تو کوئی حال تھا ہی نہیں
رائیگاں جا رہا تھا میں اظہر
اور مجھ کو ملال تھا ہی نہیں

اظہر عباس

فرشتہ پھر نہیں آیا

وہی بس ایک بار آیا تھا اپنے کام پر
اور کام بھی کیا تھا
یہی براق بندوں کو خبر نامہ سنانا
نور کا خاکہ اُڑانا
فرش پر سے مٹی کے ڈھیلے اُٹھا کر
پھر پٹخ دینا زمیں پر
یوں نشانہ باز حکموں کو بجا لانا
کہ جیسے نیزہ باز آیا ہو مشقوں سے گزر کر
اس دہانے پر کہ سب سیر و شکار
آسماں کیسے جائیں!
الف احرام ہو یا لام لنگی ہو
یا ابجد سے کوئی باہر ہو مُونس ستر کا
ہمدرد، دونوں شرم گاہوں کا
شکاری کا حرم میں داخلہ، دستور کا گر
کیسا کیسا سر تھا اس کی پھونکنی میں
وہ دہانے سے گزر آیا تھا اور ہم
ٹھیک اُس کی سیدھ میں پائے گئے تھے
بابِ استقبالیہ پر ٹھیک ٹھہرائے گئے تھے
آؤ تو صاحب یہ کن پہلو دراز آبادیوں میں
پشت پر شہپر سے شدھ جھلنا جھائے
پنکھی جھلنے آ گئے ہو
ذرا گردن کے ہلکورے ادھر لاؤ
جہاں ہم ہیں
نظر کی چور سی چھب سے یہاں انگنائی میں
گولائی میں دیکھو
ادھر گہرائی میں جھانکو
پسینہ زیرِ جاموں پر ہے، احراموں پہ کب ہے
یہ تلووں کی لڑی نعلین کی جوڑی سے ملوانے چلے ہو
پنجہ پا دیکھتے ہو
ایڑیوں کے اس گزشت ورخت سے گزرو
گراؤ مت ہمارے پائے جانے
اور چھپائے جانے کا کچرا
ہم ایسے ان پڑھوں کے
کہ ہم تشکیک اور تائید کی دو تجربہ گاہیں بنیں

دن بھر جو ٹنس ٹیسٹ کی نوروز نیلی بار
پر ٹپ ٹپ گریں
سرخی کو چھلکائیں تو سمجھیں تجربہ اچھا رہا
ایسا نہیں ہوتا
بہ دونوں پرسمیٹوں، باری باری سب کے گھر آؤ
سبھی کو جانتے جاؤ
دُعاؤں کا یہ گولا، یاں نہیں چلتا
نقاب اُلٹو
ہمارے ساتھ تم پہلو درازی، راست بازی
کے شگوفے چھوڑنے
پھل توڑنے نکلو
خدارا...... آؤ، آؤ
زندہ ہو جاؤ!!

شاہین عباس

جو ایک بوجھ تھا اس دل پہ وہ اُتار دیا
کسی خیال کو پکڑا، پکڑ کے مار دیا
میں بھیگتی ہوئی آنکھوں سے اُس کو دیکھتی تھی
پھر اپنی بھیگتی آنکھوں کو اُس پہ وار دیا
گزارنا تو نہیں چاہتی تھی ہجر کا دن
شبِ فراق کی خاطر اسے گزار دیا
وگرنہ میں تو یہ سمجھی تھی حرف روٹھ چلے
ترے سلوک نے پھر ان کو اعتبار دیا
نجانے کیا ہے کہ خود ہی کو آج تک عزت
ترے فریب دیا اور بار بار دیا

عزت مآب

دل سے تصویر تیری ہٹا دی گئی
زندگی آج ویراں بنا دی گئی
کتنی ترتیب سے کتنے آرام سے
آرزوؤں کی لبستی مٹا دی گئی
میرا سارا بدن اس میں جلنے لگا
آتش غم کو اتنی ہوا دی گئی
جو کبھی مجھ سے سرزد ہوئی ہی نہیں
ان خطاؤں کی مجھ کو سزا دی گئی
ہر طرف تہمتیں ہر جگہ سازشیں
زندگی اک تماشہ بنا دی گئی
اب تلک ہو نہ پائی ہے جس کی سحر
مری قسمت کچھ ایسے سلا دی گئی

احتشام جمیل شامی

یعنی پنجرے کی سلاخوں سے اسے کھینچنا ہے
کیونکہ اک قیدی پرندے کا یہی کہنا ہے
ایسا ممکن تو نہیں ہے تو کہے تو کون
بس تیرا اُکھڑا ہوا لہجہ نہیں سہنا ہے
حکم نامہ تو ابھی جاری ہوا ہے دیکھو
اب اشاروں سے کوئی جملہ نہیں کہنا ہے
آج پھر درد کے موسم نے کہا روتے ہوئے
تیری آنکھوں نے سمندر کی طرح بہنا ہے
سب پرندوں نے یہیں گھونسلے کھے ہوئے تھے
یعنی برگد کا یہی ٹوٹا ہوا ٹہنا ہے
تیز بارش نے کہا ہولے سے ہر پتھر سے
تیری بستی کے مکینوں کو نہیں رہنا ہے

ترے املاک کا ہے کیا وہاں لینا دینا
رونے والوں نے جہاں آنسوؤں کو پہنا ہے

املاک وجدان

میں ہواؤں کی بھی تصویر بنا سکتا ہوں
لفظ جس میں نہ ہوں تحریر بنا سکتا ہوں
سنگ و آہن کی ضرورت نہیں یکسر مجھ کو
ایک وعدے کو بھی زنجیر بنا سکتا ہوں
جاگتی آنکھیں مجھے خواب دکھا سکتی ہیں
اور میں خواب کو تعبیر بنا سکتا ہوں
ایک لمحہ جو ترے پہلو سے ہو کر گزرے
میں اُسی لمحے کو جاگیر بنا سکتا ہوں
رات کی تیرگی میں اے میرے ننھے جگنو
میں تجھے صاحب توقیر بنا سکتا ہوں

امین انجم (پروفیسر)

پاؤں جب ہو گئے پتھر تو صدا دی اُس نے
فیصلہ کرنے میں خود دیر لگا دی اُس نے
اب جو آنکھوں میں دھواں ہے تو شکایت کیسی
آج خود ہی تو چراغوں کو ہوا دی اُس نے
یہ الگ بات کہ وہ میرا طلب گار نہیں
آ کے گھر بار کی رونق تو بڑھا دی اُس نے
میری زنجیر کے حلقوں میں اضافہ کر کے
اور سچائی کی توقیر بڑھا دی اُس نے
آہ! نفرت کی وضاحت، یہ سلیقہ اُس کا
میز سے بس مری تصویر ہٹا دی اُس نے

کوئی اس کام کا مطلب نہیں سمجھا ہے شبینؔ
ایک شائستہ سی آواز دبا دی اُس نے

شبانہ زیدی

زندگی کو معجزہ درکار ہے
اک ید بیضا، عصا درکار ہے
حاکمانِ وقت کی ہے عدلیاں
جراتوں کی کربلا درکار ہے
آدمیت کو بلندی کے لیے
پھر نظام مصطفیٰ درکار ہے
کیوں بھلا کشتی بھنور سے پار ہو
ناخدا کو ناخدا درکار ہے
منزلیں تو ہیں یہیں دو چار گام
بس ذرا سا حوصلہ درکار ہے
خودنمائی ہر جگہ ہر چیز میں
کبریا کو کیا بھلا درکار ہے
ظلمتِ شب کو مٹانے کے لیے
روشنی کو راستہ درکار ہے
طالب دیدار نورِ حق ہوں
لن ترانی کی صدا درکار ہے
عاکف اس حرص و ہوس کے دور میں
کوئی لمحہ باوفا درکار ہے

عاکف عثمان عاکف

ننکانہ صاحب

محبت ترک کرنے کی......

محبت ترک کرنے کی نہ جرات ہے
نہ کر ہی سکتا ہوں اس کو
یہ خود پروان چڑھتی ہے
کبھی آکاش میں بادل
کبھی قوسِ قزح بن کر
کبھی کلیوں کی صورت
اور کبھی دھرتی پہ سبزے کی رِدا بن کر
محبت گونجتی ہے دور تک
دل کی صدا بن کر
محبت چھپ تو سکتی ہے
غلط فہمی کی دُھند
یا فاصلے کی برف کے نیچے
مگر پھر رونما ہوتی ہے بہتے وقت کی صورت
کبھی میرے ہی سینے میں
کبھی پھر اُس کے آنچل میں
محبت ترک کرنے پر بھی اکثر زندہ رہتی ہے
گلی کوچے کے ہر شخص کی زبان پر
محبت ترک کرنے کی نہ جرات ہے
نہ کر ہی سکتا ہوں

دستگیر شہزاد/ٹوبہ ٹیک سنگھ

آدمی جب خدا نہیں ہوتے
سانحے رونما نہیں ہوتے
بات ہوتی ہے معتبر اُن کی
جن کے وعدے قضا نہیں ہوتے
وقت رکھتا ہے زخم پر مرہم
ہم سفر جب جدا نہیں ہوتے
جن کو دعویٰ ہو پارسائی کا
خود ہی وہ رہنما نہیں ہوتے
آنکھ گر دیکھنے کے قابل ہو
کبھی سورج فنا نہیں ہوتے
میں نے شاید یہی تو جانا ہے
لفظ سارے دعا نہیں ہوتے

عبدالرشید

خاورِ حسن، دید باز کرو
کچھ تو ہم کو بھی سرفراز کرو
ہم خطاکار ہی سہی لیکن
ہم سے یوں بھی نہ احتراز کرو
تارِ جاں سے جمالِ جاناں تک
جانا چاہو تو، جاں گداز کرو
حسن کی لو کو ڈھونڈنے والو!
زُلفِ شب کو ذرا دراز کرو

پرتوِ دوست دل میں اُترے گا
کچھ تفکر کا ارتکاز کرو
دیکھیے انتہائے شب ہے رؤف
روشنی کا نہ فاش راز کرو

پیرعبدالرؤف شاہ نبی پوری

نہ میری جیت ہے نہ آپ کی یہ ہار کی صورت
نہ جانے کس طرح پیدا ہوئی تکرار کی صورت
بجا ہے آپ کی ناراضگی یہ بھی تو دیکھیں آپ
مرے انکار میں مضمر ہے اک اقرار کی صورت
بہت مانگی دعائیں استخارہ بھی کیا میں نے
نظر آتی نہیں بنتی کوئی دیدار کی صورت
نہ رستہ بھولتے ہیں اور نہ راہوں میں بھٹکتے ہیں
گھروں کو لوٹتے ہیں جو پرندے ڈار کی صورت
زبانِ چپ میں کرتے ہیں بہت باتیں یہ دیوانے
کہیں مل بیٹھتے ہیں جب کبھی دو چار کی صورت
نہیں کچھ فائدہ اشفاق اس لکھنے لکھانے کا
اگر اک شعر ہو نہ پائے گر شاہکار کی صورت

محمد اشفاق بیگ

یہ ہم جو غم کے مارے چل رہے ہیں
مقدر کے سہارے چل رہے ہیں
ہماری آنکھ پتھر ہو گئی ہے
ہمارے دل پہ آرے چل رہے ہیں
سمندر نیند میں ڈوبا ہوا ہے
مگر اُس کے کنارے چل رہے ہیں
ہماری خوئے دریوزہ گری سے
ہمارے کام سارے چل رہے ہیں
بس اک رنج زیاں سر پر اُٹھائے
ہمیں بھی دیکھ پیارے! چل رہے ہیں
ہمارے مسئلے اٹکے ہوئے ہیں
ہمارے سب ادارے چل رہے ہیں

تاج الدین تاجؔ

رنگ بے رنگ ہیں
لفظ بے نطق ہیں
زندگی بے مزا
موت بے ذائقہ
تنگ ہیں
اے خدا
ہم بہت تنگ ہیں

جان عالم

تمہارا غم تھا ناکافی
مگر ہم نے سہا کافی
پہنچ کر منزلوں پر بھی
پڑا ہے راستہ کافی
وہاں ہر چیز کافی تھی
جہاں کچھ بھی نہ تھا کافی
کہا کچھ بھی نہیں ہم نے
مگر ہم نے سنا کافی
بہت سوں کی ضرورت ہے
نہیں اک آشنا کافی
نہیں تھا کام کرنے کو
مگر ہم آنے کیا کافی
اگر مے ختم ہے تو پھر
مرے ساقی چلا کافی
تمہیں ہم یاد رکھنے کو
بھلا بیٹھے خدا کافی
ملا کچھ بھی نہیں ہم کو
مگر ہم سے گیا کافی
بہت گھاٹے میں ہوں نامیؔ
اُٹھا کر فائدہ کافی

رُستم نامی

ترا مکاں تو بس راستے میں آیا ہے
یہ آسماں تو بس راستے میں آیا ہے
ترے جہان میں میرا نہیں کوئی کام
ترا جہان تو بس راستے میں آیا ہے
کئی دنوں سے ترا دھیان ہی نہیں آیا
مجھے یہ دھیان تو بس راستے میں آیا ہے
یہاں قیام بہت مختصر رہے گا مرا
یہ خاک دان تو بس راستے میں آیا ہے
نہیں ملا ہے مجھے میری کوششوں کے سبب
وہ خوش گمان تو بس راستے میں آیا ہے
گزر رہا تھا سفر کس قدر سکون کے ساتھ
یہ امتحان تو بس راستے میں آیا ہے

محمد حنیفؔ

یہ دنیا مرے ہاتھ آئی نہیں ہے
مگر زندگی بھی گنوائی نہیں ہے
مرے پاس مانگے کی ہیں چند سانسیں
گنوانے کو کچھ مرے بھائی نہیں ہے
اُسے چاند تاروں کی خواہش ہے ضد ہے
مری آسماں تک رسائی نہیں ہے
وہاں تجھ کو کیسے میں آباد کر دوں
جو بستی ابھی تک بسائی نہیں ہے
فقط ایک تجھ پر ہی سب کچھ لٹا دے
نیازؔ اس قدر بھی فدائی نہیں ہے

نیازت علی نیاز

آنگن ہو ویراں بہ زوالِ در و دیوار
اور ڈوب چلے مہر و ہلالِ در و دیوار
اک لفظ سہی یاد مگر دیکھ تو لیجیے
رکھتی ہے سدا دل کا جمالِ در و دیوار
تعمیر کیا بیٹھ کے سورج کی کرن پر
ڈھ جائے نہ یہ حسن مثالِ در و دیوار
آؤ رُکی پلکوں پہ میں الہام سجاؤں
آئے جو کبھی شعر خیالِ در و دیوار
اُنگلی سے لٹک کرتے اک جھیل پھر کہے گی
بس بھول بھی جاؤ نہ ملالِ در و دیوار
ہو بند تری قید میں اے شہر گلہ کش
عریاں ہو مری ذات اُٹھا لے درِ و دیوار

احمد علی کیف

خاک سر پہ سجائے پھرتا ہوں
دیکھ! خود کو چھپائے پھرتا ہوں
روشنی ڈھونڈتا ہوں گلیوں میں
اپنے گھر کو جلائے پھرتا ہوں
سنگ باری کا شہر میں عالم
خود کو شیشہ بنائے پھرتا ہوں
کل جو دیکھا تھا آپ کا چہرہ
آج خود کو بھلائے پھرتا ہوں
ایک عالم جگا دیا میں نے
اپنی قسمت سلائے پھرتا ہوں

ریحان بشیر شاد

خواب و خیال و عشق میں یکجائی چاہیے
میں کیا کروں مجھے ابھی تنہائی چاہیے
برپا ہے وہ تماشا ہماری زمین پر
افلاک کہہ رہے ہیں کہ بینائی چاہیے
نخرہ اُچھال بالوں کا گجرا اُچھال یار
منہ زور آندھیوں کو توانائی چاہیے
رکھتا ہوں اُس کی آنکھوں کے آگے ترا سوال
کتنی ترے جہانوں کو گہرائی چاہیے
دربار ہوں کہ غار، ہزیمت نے کوئی
مٹی کے پیرہن کو تماشائی چاہیے
نظمیں کہوں تو کورا بدن بولنے لگے
اور سطر سطر میں تری رعنائی چاہیے
اک دشت جس میں کھل کے ہرن چوکڑی بھریں
اور آبِ خال و خد کی زلیخائی چاہیے
ایسے پکارتے ہیں ترے بادیہ نشین
جیسے خلاؤں کو کوئی سودائی چاہیے
جو ہاتھ تھام لے تو محلے چھک پڑیں
عامر ہو حور بھی تو علاقائی چاہیے!

عامر سہیل

اب میں اس کو اتنی مہلت دیتا ہوں
جب وہ تنہا رہ جائے تب لوٹ آئے

بہاول نگر میں مقیم ممتاز شاعر

عامر سہیل

کے شعری مجموعوں

☆لبادہ
☆تیوہار کا پانی (ایوارڈ یافتہ)
☆مشہد عشق
☆غدر کے پھول
☆عشق کی چادر
☆کچھ طائر پنکھ گراتے ہیں
☆دجلۂ دل

کے بعد تازہ شعری مجموعہ

زبورِ عشق

جلد شائع ہو رہا ہے

زلف رُخسار سے جلاتا ہوں
ہونٹ چنتا ہوں داستانوں سے
سانس لیتے ہیں اس محبت میں
اس کو روندا نہیں بہانوں سے
لوگ مر مر کے تھک گئے عامر
خوف جاتا نہیں جہانوں سے

اہتمام: نستعلیق مطبوعات

فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور

ذرا سی دیر میں الہام ہونے والا ہے
مرا رُکا ہوا اک کام ہونے والا ہے
میں اب عطائے ودیعت کے انتخاب میں ہوں
یہ کشف مجھ پہ بہت عام ہونے والا ہے
اسیر ذات کو شاہد مغالطہ تھا یہی
وہ مشتہر کہیں گم نام ہونے والا ہے
ہمیشہ جس نے اُٹھایا ہے شہرتوں سے مفاد
وہ اب کے مفت میں بدنام ہونے والا ہے
مری خطا پہ کسی اور کو ملی ہے سزا
کسی کا جرم مرے نام ہونے والا ہے
یہ کھیل پردۂ سیمیں کی دسترس میں نہیں
تماشا اب جو سر عام ہونے والا ہے
امیر شہر تو بدنام تھا بہت دن سے
غریب شہر بھی بدنام ہونے والا ہے
اُسے گماں تھا کہ تسخیر کر رہا جہاں
مجھے یقیں تھا وہ ناکام ہونے والا ہے
تماشا اب کے ہے بے جان پتلیوں کا طراز
ہمیں خبر ہے جو انجام ہونے والا ہے

فاروق طراز

تیز چلنے سے ڈر رہا تھا میں
خستہ زینے اُتر رہا تھا میں
اپنے قدموں کی چاپ سنتا ہوا
آئنوں سے گزر رہا تھا میں

آیتوں جیسے خال و خد اُس کے
اپنی آنکھوں میں بھر رہا تھا میں
میری آواز سن رہا تھا وہ
اُس کے اندر اُتر رہا تھا میں
یک بیک روشنی سی ہونے لگی
آگ میں پاؤں دھر رہا تھا میں
رات اک بے صدا جزیرے میں
رقص ہی رقص کر رہا تھا میں

فیصل ہاشمی/کبیر والا

جب تک تو میری آنکھ سے اوجھل نہیں ہوا
دل بے قرار و بے سکوں، بوجھل نہیں ہوا
سر پر کبھی عطاؤں کا بادل نہیں ہوا
مقروض میں کسی کا بھی اک پل نہیں ہوا
تم دوسرے کی آس میں پھرتے ہو کُوبہ کُو
ہم سے تو ایک عشق مکمل نہیں ہوا
یہ سال بھی گزار دیا سوچتے ہوئے
کوشش کے باوجود بھی تو حل نہیں ہوا
آنکھوں کے سامنے سے نہ چہرہ ہٹایئے
دیکھو ابھی میں ٹھیک سے پاگل نہیں ہوا
گوندھا ہے خود کو بارہا، رکھا ہے چاک پر
اہل قبیلہ میں یونہی صندل نہیں ہوا
ہم کاروانِ شوق کو منزل کی ہے خبر
رستہ ہماری آنکھ سے اوجھل نہیں ہوا

احسان ہے حسینؑ کا اہل زمین پر
مقتل کے بعد پھر کوئی مقتل نہیں ہوا
اُس نے رکھا ہوا ہے بدن کے حصار میں
مظہر میں اپنے آپ مقفل نہیں ہوا

مظہر بخاری

تھیا تھیا

کوئی دروازہ کھلتا ہے نیا
محسوس ہوتا ہے
دوبارہ اک نئی دنیا کا
لگتا ہے جہاں بدلا
کوئی جب پیار کرتا ہے
تو جھرنے پھوٹنے لگتے ہیں
روشن آبگینوں سے
سحر کے آئینے میں
عکس شبنم کا اترتا ہے
گلوں کا روپ لیکر
زندگی پہلو بدلتی ہے
کوئی جب پیار کرتا ہے
صباحت کے لبادے میں
کوئی کونپل نکلتی ہے
افق کے پار اک روپہلی جھانجھر رقص کرتی ہے
شفق کی چاشنی چنچل لبوں پر جھلملاتی ہے
کوئی جب پیار کرتا ہے
کوئی جب پیار کرتا ہے

13 May 2009
SHINKANSEN-TOKYO

عامر بن علی

متفرق نثری نظمیں

تمہارا نام

مرے لبوں سے تمام وحشت پھیل گئی ہے
تناؤ سب کچھ اُتر گیا ہے
خموشیوں میں جو بیکراں تھا
وہ ایک جذبہ زباں پہ آ کر
بس تمہارا نام بن کے رہ گیا ہے

شازیہ محسن/خانیوال

لاجواب......!

ہاں......تم نے!
کبھی بادلوں سے برسنے کی وجہ پوچھی ہے؟
کبھی ہوا کی صدائیں سنی ہیں؟
کبھی پانی پہ تحریریں لکھی ہیں؟
کبھی سناٹے کے آئینے میں چاند کو دیکھا ہے؟
ہاں......تم نے!
کبھی سوکھے درخت کی پکار سنی ہے؟
کبھی گیلی لکڑی کو جلتے دیکھا ہے؟
کبھی سنہری ریت پہ پاؤں کے نشاں دیکھے ہیں؟
کبھی پرندوں کو ہجرت کرتے دیکھا ہے؟
کبھی خود سے ملاقات کی ہے؟
ہاں......تم نے!
کبھی دسمبر کا انتظار کیا ہے؟
نہیں ناں......!!
تو پھر کیسے کہتی ہو
تمہیں بھی محبت ہے کسی سے......؟

شہزاد ملک/خیر پور ٹامے والی

تلاش

جب آسمان پر شفق پھیلنے لگے
جب پرندے اپنے گھروں کو چلنے لگیں
بدلیوں کی اوڑ سے جب چاندنی جھانکنے لگے
اور اپنا عکس دکھانے لگے
ایسے میں اکثر میں اُداس ہو جاتی ہوں
پچھلی یادوں کو یاد کرنے لگتی ہوں
جب تم میرے ساتھ تھے
ہر شے حسین تھی
ہر طرف بہار تھی
اب ہو گئے تم جدا
اور میں ان اُداس
لمحوں میں تمہیں تلاش کرتی ہوں

عنبرین اختر/لاہور

ذرا سے ایک لمحے میں
صدیوں کی مسافت ہے
یونہی میں ہار بیٹھی ہوں
محبت کی میرے
اندر جو ایک روشنی تھی
وہ تاریکی میں اب ڈوبی
کہ جب بھی آنکھ کھولوں میں
اندھیرا ہی اندھیرا ہے
بہت ہی ڈر لگتا ہے
بچھڑنے میں مجھے تم سے
کہ یہ دنیا ہے
قبرستان!!
اور میں کفن میں لپٹی
اندھیری قبر میں سسکتی ہوں
خوف و ہراس چاروں طرف
کسی کا ساتھ نہ کوئی
سنو تم!!
مجھے اس ڈر سے نکال دو
میری بکھری ہے
جو بستی
اُسے تم سنوار دو
تنہائیوں کو میری تم
خوشیوں پہ مات دو
کہ جاناں یہ دنیا
ہے بسی ہوئی
میرے دل سے
اندھیری قبر کا
خوف نکال کہ
مجھے پھر سے نایا تم
محبت کا ہار دو
یونہی محبت سے
محبت میں نکھار دو

نایا سحر

رفیع الدین راز/کراچی

ایک قطرہ کیا مری آنکھوں پہ آ کے کھل گیا　　میں سمندر سے کھلا مجھ سے سمندر کھل گیا

رفیع الدین راز کی شاعری میں فکر بھی ہے اور اسلوب بھی۔ جب کہ اکثر شعرا کے کلام میں فکر ہوتی ہے تو اسلوب نہیں ہوتا اور اسلوب ہوتا ہے تو فکر نہیں ہوتی۔ اس لیے ہم ان کی شاعری کو بڑی شاعری کے زمرے میں نہیں لا سکتے۔ مگر رفیع الدین راز ایک صاحب اسلوب شاعر بھی ہیں اور خوش فکر بھی۔ ان کا کلام پڑھ کر ناقدین کی اس رائے سے اختلاف کرنا پڑتا ہے کہ کوئی خیال نیا نہیں ہوتا۔ راز صاحب کی شاعری میں ندرتِ خیال بھی ہے اور نئے خیالات کی بھرمار بھی۔ ان کے متعدد اشعار اُردو زبان و ادب اور شعر و سخن میں اضافہ شمار ہوتے ہیں۔ (شاعر علی شاعر)

قطرۂ شبنم کو پلکوں سے اُٹھانا آ گیا
میں کہ جس کا منتظر تھا وہ زمانہ آ گیا

ہُوبہُو میری ہنسی ہے سر بسر لہجہ مرا
میرے بچے کیا تمھیں بھی غم چھپانا آ گیا

کنجِ تنہائی میں ہم نے کیا گزاری ایک رات
درد کی لو سے چراغوں کو جلانا آ گیا

ہاں یہ میرا نقشِ پائے شوق ہے جس کے طفیل
آندھیوں کو ریت پر چہرہ بنانا آ گیا

گاہے گاہے جسم و جاں پر خود ہی رکھتا ہوں نمک
زندگی سے اب مجھے رشتہ نبھانا آ گیا

زیرِ پا جو آگ ہے اس آگ پر کیا تبصرہ
یہ شرف کیا کم ہے خود کو آزمانا آ گیا

درد جزوِ قطرۂ خوں بن گیا ہے یا مجھے
رنگ اور خوشبو کا آمیزہ بنانا آ گیا

نمو میں دوڑتی ہے رنگ و بو میں رقص کرتی ہے
وہ اک تہذیب جو میرے لہو میں رقص کرتی ہے

بھنور تو چاہتا ہے فتح کر لینا سمندر کو
نسیمِ صبح کس کی جستجو میں رقص کرتی ہے

نہ جانے کس کی چاہت میں ہے یہ خورشید سرگرداں
یہ دنیا جانے کس کی آرزو میں رقص کرتی ہے

عبارت ہے، ہمارے قطرہ ہائے خوں کی گردش سے
وہ اک نادیدہ مستی جو سبُو میں رقص کرتی ہے

مرا طرزِ تکلم رنگ بھرتا ہے مناظر میں
مری خاموشی بزمِ ہاؤ ہُو میں رقص کرتی ہے

عروسِ درد جب بھی گنگناتی ہے کوئی نغمہ
حرارت زندگی کی گفتگو میں رقص کرتی ہے

ضیائے نشہ ہائے بندگی اب بحر کی صورت
مرے ہر قطرۂ آبِ وضو میں رقص کرتی ہے

حصارِ ذات سے باہر نکل جانے کی ٹھانی ہے
ذرا میں بھی تو دیکھوں مجھ میں کتنی بے کرانی ہے

کسی سے پوچھتے کیا ہو جبینوں پر نظر ڈالو
لکیریں خود کہیں گی کس نے کتنی خاک چھانی ہے

فریبِ بال و پر میں قید ہے احساس کا طائر
شعور و آگہی پر بھی قفس کی حکمرانی ہے

متاعِ آرزو اشکوں کی صورت آنکھ میں آ کر
ٹھہر جائے تو گوہر ہے جو بہہ جائے تو پانی ہے

کنارے سے نکل کر چاہتی ہے بے کراں ہونا
نفس کی رو ہے یا پُرشور دریا کی روانی ہے

سوائے گردِ راہِ شوق کیا رکھا ہے قصے میں
ہماری زندگی خانہ بدوشوں کی کہانی ہے

ہمیں انصاف ملنے میں ذرا تاخیر تو ہوگی
زمیں پہ بسنے والوں کی عدالت آسمانی ہے

مری آنکھوں سے مہر و ماہ پیہم بات کرتے ہیں
مرے پیکر میں روشن اک جہانِ خوش گمانی ہے

سلوکِ دوستاں پر رازؔ تم حیرت زدہ کیوں ہو
نئے ہیں زخمِ جاں لیکن روایت تو پرانی ہے

مہ و خورشید و اختر لکھ رہا ہوں
ترے چہرے کا منظر لکھ رہا ہوں

بہت تذلیل آنکھوں کی ہوئی ہے
سو اب ہر غم کو اندر لکھ رہا ہوں

حرارت وقت کی کیسے نہ ہوگی
میں ہر لمحے کو چھو کر لکھ رہا ہوں

یہ رنگِ قصہ ہائے عہدِ حاضر
خیالِ زیست پرور لکھ رہا ہوں

سرابوں کا بھرم رکھنے کی خاطر
میں صحرا کو سمندر لکھ رہا ہوں

نظر میں احترامِ رہ گزر ہے
سو پتھر کو گُلِ تر لکھ رہا ہوں

کوئی ساعت ہے پیشانی کی زینت
کسی کو لوحِ دل پر لکھ رہا ہوں

تصرف میں کہیں سادہ ورق ہے
کہیں پر کچھ مٹا کر لکھ رہا ہوں

میں اب لگتا ہوں خود کو پورے قد کا
مگر یہ بات جھک کر لکھ رہا ہوں

مظفر حسن منصور/جوہر آباد

دریچے پر پڑا پردہ ہوا سے سرسراتا ہے　　ذرا سی بات ہے لیکن مرا دل خوف کھاتا ہے

اس دشت میں ہیں آبلہ پا دور دور تک
جاری ہے سلسبیلِ وفا دور دور تک
کھلتے نہیں کسی پہ مری خامشی کے بھید
پھیلا ہوا ہے کوہِ ندا دور دور تک
ہے ہیچ میرا ذوقِ سفر ان کے سامنے
میں جن کے ساتھ ساتھ گیا دور دور تک
زلفوں کی چاندنی ہے نہ حسنِ نظر کی دھوپ
گل ہے نہ کوئی برگِ نوا دور دور تک
رقصاں ہیں گردباد تھرکتے ہیں ریگزار
برپا ہے جشنِ مرگِ وفا دور دور تک
ایسا نہ ہو کہ درپئے آزار ہو جہاں
اے روشنیِ طبع نہ جا دور دور تک
منصور اوجِ دار پہ کیا ماجرا ہوا
چھایا افق پہ رنگِ حنا دور دور تک

روشنی کی، پانی کی اور ہوا کی قیمت کیا
قدرِ زندگی کیسی اور شکر نعمت کیا
ظلم و جور کی راہیں ختم ہو نہ جائیں گی
مسلکِ شرافت کیا مذہبِ محبت کیا
کس قدر کشادہ ہے یہ دیارِ محرومی
سوچتا ہوں دنیا کی ہے مجھے ضرورت کیا
روبرو تمہارے ہوں جس طرح ہوں جیسا ہوں
لائقِ ستائش کیا قابلِ ملامت کیا
میں بھی مضطرب سا ہوں وہ بھی ہیں پریشاں سے
کیجے صراحت کیا چاہیے وضاحت کیا .
عشق نے مجھے بخشا اک مزاجِ غم آگیں
درد خود ہی دیتا ہے درد کی ضمانت کیا
صرف خاص لوگوں کی آپ تک رسائی ہے
عام نہیں ہو سکتی آپ کی مروت کیا
ایک بار اٹھایا ہے بارِ زندگی میں نے
تا ابد ضروری ہے یہ کڑی مشقت کیا
پیار میں خوشامد سے کام اب نکلتے ہیں
حسن کو لبھانا ہے شیوۂ محبت کیا
بار بار سمجھانے کا ہے فائدہ کوئی
ختم ہو نہیں سکتی آپ نصیحت کیا
دل میں خود شناسی کا ذوق گر نہ ہو منصور
نفس کی طہارت کیا نام کی عبادت کیا

دریچے پر پڑا پردہ ہوا سے سرسراتا ہے
ذرا سی بات ہے لیکن مرا دل خوف کھاتا ہے
ٹپکتی ہے مرے کمرے کی چھت آہستہ آہستہ
کوئی رہ رہ کے جیسے آنکھ سے آنسو بہاتا ہے
ہوئے شائستۂ غم اس قدر اب سامنا ہو بھی
میں آنسو ضبط کرتا ہوں وہ رونا بھول جاتا ہے
کوئی دیکھے دیارِ شوق کی بے سازو سامانی
مرا دل کاغذی پھولوں سے گھر اپنا سجاتا ہے
بکھر جاتا ہے پیراہن ہوا میں دھجیاں بن کر
گلوں کے چاک سینے کا سلیقہ کس کو آتا ہے
کبھی وہ پاس آ کر میرے جذبوں کو پرکھتا ہے
کبھی وہ دور رہ کر میرے جوہر آزماتا ہے
بدن میں روح میرے اس طرح بے تاب رہتی ہے
کہ جیسے قید میں کوئی پرندہ پھڑپھڑاتا ہے
یہ حسنِ فکر یہ طرزِ ادا منصور لگتا ہے
گلِ تخلیق کا تیرے قلم سے کوئی ناتا ہے

ظلمت کدۂ دل میں وہ ایماں کی طرح تھا
یزداں تو نہیں پرتوِ یزداں کی طرح تھا
خورشید جو ابھرا تو مرے خوں میں نہا کر
میں بھی شفقِ صبحِ گلستاں کی طرح تھا
وہ مجھ سے بچھڑتا تو اسے ڈھونڈ بھی لیتا
مشکل تو یہی ہے وہ رگِ جاں کی طرح تھا
تو نے ہی مرے ذہن کو شاداب کیا ہے
میں سوچ کے عالم میں بیاباں کی طرح تھا
برسوں کی رفاقت کا صلہ کیا مجھے دیتا
صحرا بھی کسی بے سروساماں کی طرح تھا
پائی نہ کوئی راہ بھی ہموار جہاں میں
ہر راستہ اس گیسوئے پیچاں کی طرح تھا
بکھرا ہوا ہر پھول گلستانِ وفا کا
منصور کے افکارِ پریشاں کی طرح تھا

صبح شگفتہ شام جواں تھی آپ کو شاید یاد نہ ہو
عمرِ رواں اک جوئے رواں تھی آپ کو شاید یاد نہ ہو
اب خاموشی ایک حقیقت بن کر سامنے آئی ہے
کبھی ہمارا طرزِ بیاں تھی آپ کو شاید یاد نہ ہو

ارشد محمود ناشاد/اسلام آباد

جن کے ذرّوں کو بھی سورج کا سلام آتا ہے
ہم انہی راہ گزاروں کے ستائے ہوئے ہیں

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد صاحبِ علم وفضل ہیں لیکن انہوں نے اپنی غزل کو علم وفضل سے بوجھل نہیں ہونے دیا۔ اُن کے مجموعۂ کلام "رنگ" کی جملہ غزلوں میں شعریت ہی ان کی اولین ترجیح اوران کے اشعار کا نمایاں وصف نظر آتی ہے۔ فارسی شاعری کے مطالعے نے انہیں مضمون آفرینی کا ذوق عطا کیا ہے اور علم عروض پر ماہرانہ گرفت نے انہیں کم کم مستعمل بحروں میں اظہار کا حوصلہ دیا ہے۔ انسان اور اس کے اردگرد موجود کائنات کا رہا وہ حواسِ خمسہ سے بھی محسوس کرتے ہیں اور اس کی مابعدالطبیعاتی سطح کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ (سید امتیاز احمد)

وہ کیا جہاں ہے جہاں سب جہاں اُترتے ہیں
وہ کیا زمیں ہے جہاں آسماں اُترتے ہیں

ترے چمن سے خزاں کا گزر نہیں ہوتا
ترے چمن میں گُلِ جاوداں اُترتے ہیں

بس ایک بار وہ شہرِ جمال دیکھنا ہے
جہاں پہ مہر و مہ و کہکشاں اُترتے ہیں

نگاہِ شوق نے خوابوں میں جن کو دیکھا ہے
بیاضِ دل سے وہ منظر کہاں اُترتے ہیں

اگر خیال میں شامل ہو تیرے ذکر کا نم
ورق ورق پہ کئی گلستاں اُترتے ہیں

خدا کا شکر ہے کہ نسبت ہے اُس دیار کے ساتھ
پئے سلام ملائک جہاں اُترتے ہیں

طلبِ غیر میں جو خود کو بھلائے ہوئے ہیں
جانے کس خاک سے وہ لوگ اُٹھائے ہوئے ہیں

اب رہائی تجھے ہم سے نہیں ملنے والی
زندگی! تو نے بہت زخم لگائے ہوئے ہیں

ان پہ اب رنجِ سفر کھینچنا ہوگا تم کو
یہ تو وہ رستے ہیں جو تیرے دکھائے ہوئے ہیں

حاصلِ عشق نہیں کچھ بھی بہ جز داغِ وفا
ہم بھی گارِ گراں مایہ اُٹھائے ہوئے ہیں

بندشِ ضبط! ذرا دیر کی مہلت دے دے
اشک اب آنکھ کی دہلیز تک آئے ہوئے ہیں

جن کے ذرّوں کو بھی سورج کا سلام آتا ہے
ہم انہی راہ گزاروں کے ستائے ہوئے ہیں

ہوسِ راحت و عشرت نہیں کھینچی ہم نے
ہاں ترا درد کہ سینے سے لگائے ہوئے ہیں

ہم جنوں پیشہ کہ رہتے تھے تری ذات میں گم
ہو گئے سلسلۂ گردشِ حالات میں گم

عرصۂ وصل میں بھی حرفِ تمنا نہ کھلا
حسنِ الہام رہا پردۂ آیات میں گم

عقل انگشت بہ دنداں ہے نظر حیراں ہے
کون سی چیز ہوئی ارض و سماوات میں گم

کتنے کنعان ہوئے خوابِ زلیخا میں اسیر
کتنے یعقوب رہے ہجر کے صدمات میں گم

کوئی مائل بہ سماعت نہ ہوا صد افسوس!
نغمۂ درد رہا سینۂ جذبات میں گم

میں ترے شہر سے گزرا ہوں بگولے کی طرح
اپنی دنیا میں مگن، اپنے خیالات میں گم

درد کا نقش بنا، کرب کی تصویر ہوا
میں جنوں کیشِ ازل، کشتۂ تقدیر ہوا

مجھ کو مسمار نہ کر عرصۂ نادانی میں
میں زمانوں کی ریاضت سے ہوں تعمیر ہوا

زخم کیا زخم کہ جو چارہ گری کو ترسے
خواب کیا خواب جو منت کشِ تعبیر ہوا

کیوں بلاتا ہے چمن زار مجھے اپنی طرف
اب تو ویرانہ مرے پاؤں کی زنجیر ہوا

ہاتھ آتی نہیں اب کوئی یقیں کی صورت
بے خیالی میں عجب وہم بغل گیر ہوا

مجھ کو جو درد بھی چھو جائے وہ راحت ہو جائے
آتشِ ہجر کی لذت سے میں اکسیر ہوا

کوئی پیرایۂ اظہار ملے اُس کو بھی
ورقِ دل پہ جو افسانہ کہ تحریر ہوا

نگہ میں، قلب میں، گل میں، شباب میں خوشبو
رہی جہاں بھی رہی اضطراب میں خوشبو

یہ کس کے حسنِ نظر سے ہے کائنات میں رنگ
یہ کس کا فیض عطا ہے گلاب میں خوشبو

ورق ورق پہ گلستاں نثار ہوتا ہے
رکھی ہے کس نے یہ دل کی کتاب میں خوشبو

یہ کس گداز بدن کی کرشمہ کاری ہے
گھل رہی ہے بہت جوئے آب میں خوشبو

مہک رہا ہے ابھی تک یہ خاک دانِ وجود
بس ایک بار کہ اُتری تھی خواب میں خوشبو

عشرت آفرین/امریکہ

پڑھ رہا تھا وہ کسی اور کے آنچل پہ نماز
میں بس آئینہ و قرآن لیے حیراں تھی

وہی مضافاتوں کے بھید بھرے سناٹوں والے گھر
گڑیوں کے لب سی کر ان کا بیاہ رچاتی دوپہریں
کھڑکی کے ٹوٹے شیشوں پر ایک کہانی لکھتی ہیں
منڈھے ہوئے پیلے کاغذ سے چھن کر آتی دوپہریں
نیم تلے وہ کچے دھاگے رنگتی ہوئی پرانی یاد
گھیرا ڈالے چھوٹی چھوٹی ہاتھ بٹاتی دوپہریں
پھٹی پرانی کتھری اوڑھے دھوپ سینکتے بوڑھے دن
پیشانی تک پلو کھینچے چلم بناتی دوپہریں
پانی کی تقسیم کے پیچھے جلتے کھیت سلگتے گھر
اور کھیتوں کی زرد منڈیروں پر کملاتی دوپہریں
پروائی سے لڑتے کتنے ورق پرانی یادوں کے
سوغاتوں کے صندوقوں کو دھوپ دکھاتی دوپہریں
دکھتی آنکھیں زخمی پوریں اُلجھے دھاگوں جیسے دن
بادل جیسی اوڑھنیوں پر پھول کھلاتی دوپہریں
اوڑھنیوں کے اُڑتے بادل رنگوں کے بازاروں میں
چوڑی کی دوکانوں سے وہ ہمیں بلاتی دوپہریں
سنتے ہیں اب ان گلیوں میں پھول شرارے کھلتے ہیں
خون کی ہولی کھیل رہی ہیں رنگ نہاتی دوپہریں
یہ تو میرے خواب نہیں ہیں یہ تو میرا شہر نہیں
کس جانب سے آ نکلی ہیں یہ گہناتی دوپہریں

لڑکیاں پاؤں جیسے مقدر کیوں رکھتی ہیں
تن صحرا اور آنکھ سمندر کیوں رکھتی ہیں
عورتیں اپنے دکھ کی وراثت کس کو دیں گی
صندوقوں میں بند یہ زیور کیوں رکھتی ہیں
وہ جو آپ ہی پوجی جانے کے لائق تھیں
چمپا سی پوروں میں پتھر کیوں رکھتی ہیں
وہ جو رہی ہیں خالی پیٹ اور ننگے پاؤں
بچا بچا کر سر کی چادر کیوں رکھتی ہیں
بند حویلی میں جو سانجھے ہو جاتے ہیں
ان کی خبر دیواریں اکثر کیوں رکھتی ہیں
صبح وصال کی کرنیں ہم سے پوچھ رہی ہیں
راتیں اپنے ہاتھ میں خنجر کیوں رکھتی ہیں

یہ نہیں غم کہ میں پابند غم دوراں تھی
رنج یہ ہے کہ مری ذات مرا زنداں تھی
صبح سے آئینہ چھوتے ہوئے ڈر لگتا ہے
رات ہی خواب میں دیکھا تھا کہ مانگ افشاں تھی
سوکھتی جاتی ہے اب ڈھلتی ہوئی عمر کے ساتھ
باڑھ مہندی کی جو دروازے پہ اپنے ہاں تھی
شمعیں اور سائے سے دیکھے گئے طوفان کی رات
اس حویلی میں جو مدت سے بہت ویراں تھی
خاک میں کھیل کے سب نشوونما پائی ہے
بنت افلاس ہوں میں بھوک تو میری ماں تھی
پڑھ رہا تھا وہ کسی اور کے آنچل پہ نماز
میں بس آئینہ و قرآن لیے حیراں تھی

میں اپنے عذاب لکھ رہی تھی
زخموں کا حساب لکھ رہی تھی
پھولوں کی زباں کی شاعرہ تھی
کانٹوں سے گلاب لکھ رہی تھی
اس پیڑ کے کھوکھلے تنے پر
اک عمر کے خواب لکھ رہی تھی
آنکھوں سے سوال پڑھ رہی تھی
پلکوں سے جواب لکھ رہی تھی
ہر بوند شکستہ بام و در پر
بارش کا عتاب لکھ رہی تھی
اک نسل کے خواب کے لہو سے
اک نسل کے خواب لکھ رہی تھی
پھولوں میں ڈھلی ہوئی یہ لڑکی
پتھر پہ کتاب لکھ رہی تھی

اور چپ ہے لہو

مہرباں شہر میں
بے اماں شہر میں
رات خاموش ہے
درد کا چاند گھٹتا دکھائی نہ دے
جز فغاں کوئی آہٹ سنائی نہ دے
راستے خوں فشاں
گنگ ہیں قہقہوں سے بھری کھڑکیاں
ہم تو سنتے چلے آئے تھے میری جاں
بولتا ہے ضرور آستیں کا لہو

شاعر علی شاعر/کراچی

دمِ آخر بھی بچے کی زباں پر بس یہ جملہ تھا
مرے ابو ابھی تک کیوں دوا لے کر نہیں آئے

شاعر علی شاعر کی شاعری گلشن شعر و ادب میں تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی ہے۔ ان کی طبع موزونیت ان کو زود گوئی پر اُکساتی ہے اور وہ شعر تخلیق کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک ان کے ۷ اشعری مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں۔ وہ حمد، نعت، منقبت، سلام، نظم اور غزل لکھتے ہیں جن میں ان کو یکساں مقبولیت حاصل ہے۔ مگر ان کی وجہ شہرت غزل گوئی ہے۔ شاعری میں تجربات ان کی فطرت میں شامل ہیں۔ ایک بحر سو غزلیں مجموعہ اس کا ثبوت ہے۔ (رفیع الدین راز)

عشق کی بازی جیت کے ہاری جا سکتی ہے
تیرے بنا بھی عمر گزاری جا سکتی ہے
ملنے میں ہے تجھ کو دھڑکا رُسوائی کا
اور فرقت میں جان ہماری جا سکتی ہے
میری آنکھوں کا آئینہ بھی تو دیکھو
اس میں بھی تو زُلف سنواری جا سکتی ہے
عقل و دانش، فہم و فراست اور ہمت سے
ذوق نیا پار اُتاری جا سکتی ہے
مل کر ہم کو لڑنا ہے دشمن سے ورنہ
جان ہماری باری باری جا سکتی ہے
گھر کر بیٹھیں حرص و ہوس اور لالچ جس میں
کیا اس دل سے دنیا داری جا سکتی ہے
جان ہتھیلی پر جو شاعر رکھ کر جائے
تیرے محل میں اس کی سواری جا سکتی ہے

محشر ہی بپا ہے نہ قیامت کی گھڑی ہے
پھر بھی میں جسے دیکھوں اسے اپنی پڑی ہے
اس سے مری خودداری کی لپٹی ہیں طنابیں
تنہائی کے صحرا میں مری ذات گڑی ہے
محصور اَنا کا تو نکل آتا ہے مشکل
دیوار پہ دیوار پہ دیوار کھڑی ہے
لڑنے کو حوادث سے جو تیار ہوئے ہم
اب گردشِ ایام کو خود اپنی پڑی ہے
اوروں کی حفاظت کی وہاں بات کرے کون
حاکم کو جہاں اپنی حفاظت کی پڑی ہے

اُمید یہ قائم ہے زمانے کا بھرم بھی
مجھ کو بھی تجھے پانے کی اُمید بڑی ہے
اس درجہ کبھی ٹوٹ کے چاہا نہیں تو نے
شاید یہ تری مجھ سے بچھڑنے کی گھڑی ہے
پہنچا ہوں کہاں خود سے میں لڑتا ہوا شاعرؔ
سورج ہے سوا نیزے پہ اور دھوپ کڑی ہے

مری تقدیر کی آب و ہوا لے کر نہیں آئے
برائے نام بادل تھے گھٹا لے کر نہیں آئے
تمہاری خیریت مطلوب تھی آنا پڑا ہم کو
ہم اپنے دل میں کوئی مدعا لے کر نہیں آئے
دمِ آخر بھی بچے کی زباں پر بس یہ جملہ تھا
مرے ابو ابھی تک کیوں دوا لے کر نہیں آئے
خدا ہے خالقِ ارض و سما اے منکرو! مانو
تم اپنے ساتھ یہ ارض و سما لے کر نہیں آئے
مری قسمت میں شاید حبس کا موسم ہی لکھا تھا
ترے دامن کے جھونکے بھی ہوا لے کر نہیں آئے
گھرے جب ناگہانی آفتوں میں لوگ تب سوچا
نصیبِ دشمناں ماں کی دعا لے کر نہیں آئے
خمیرِ جسمِ شاعرؔ میں وفا پہلے سے شامل تھی
مگر بدقسمتی سے تم وفا لے کر نہیں آئے

کرتا نہیں کسی سے کبھی بات آگ پر
وہ شخص جو گزارے ہر اک رات آگ پر
عشاق کے نصیب میں جلنا ہے کس لیے
لکھی ہیں کس نے ہجر کی آیات آگ پر
اُس کربِ انتظار کا عالم نہ پوچھیے
جس میں گزرتے ہیں سبھی لمحات آگ پر
اُس کے بدن کو چھو کے کچھ ایسا لگا مجھے
جیسے کہ پڑ گیا ہو مرا ہاتھ آگ پر
دو چار دن کی بات ہو تو صبر بھی کروں
کیسے گزاروں عمر کی ہر رات آگ پر
تم کو محبتوں کا یقیں کیسے آئے گا
میں آگ رکھ لوں ہاتھ پہ یا ہاتھ آگ پر
رونے سے دل کی آگ بھڑکتی ہے اور بھی
شاعرؔ نے کر کے دیکھ لی برسات آگ پر

سخن شناس ہوں، اہلِ نظر ہماری طرح
کوئی تو شعر لکھے، پُر اثر ہماری طرح
بُرا بھی چاہے کوئی تو بُرا نہیں لگتا
جہاں میں کس کا ہے حسنِ نظر ہماری طرح
جنوں کو بخشی ہیں وہ سرفرازیاں ہم نے
کہ دار پر بھی رکھتے ہیں سر ہماری طرح
کوئی نہیں جو اک آنسو میں داستاں کہہ دے
کہانی غم کی کرے مختصر ہماری طرح
جگر کے خون سے شعروں کو زندگی دی ہے
ادب میں کس کا ہے کارِ ہنر ہماری طرح
رہِ حیات میں چھالوں کی بھی خبر نہ رہی
سفر میں کون ہے محوِ سفر ہماری طرح
جلیں بھی دھوپ میں، سایا بھی دیں، ثمر بھی دیں
کوئی تو بن کے دکھائے شجر ہماری طرح

احسان شاہد/لندن

جنہیں ہم نے تراشا تھا اُنہیں پوجا گیا آخر
بتوں کو سامنے اپنے خدا ہوتے ہوئے دیکھا

دن کو وہ آفتاب دیتا ہے
رات کو ماہتاب دیتا ہے
اُس کے کانٹے بھی ہیں قبول مجھے
جو ہمیشہ گلاب دیتا ہے
سب کی بگڑی سنوارنے والا
کب کسی کو عذاب دیتا ہے
روزِ محشر حساب کیا لے گا
جو مجھے بے حساب دیتا ہے
پہلے بھرتا ہے نیند آنکھوں میں
اور پھر اُن کو خواب دیتا ہے
کون احسانؔ دیتا ہے عزت
وہی عزت مآب دیتا ہے

نشے میں کیا سے کیا کہتا رہا ہوں
محبت کو برا کہتا رہا ہوں
خدایا درگزر کرنا میں تجھ کو
فقط اپنا خدا کہتا رہا ہوں
قدم اُلٹے پڑے ہیں راستوں پر
اندھیروں کو ضیاء کہتا رہا ہوں
سنائی دی کسی کی ان کہی بھی
خموشی کو صدا کہتا رہا ہوں
کسی کی صرف دل جوئی کی خاطر
میں خود کو بے وفا کہتا رہا ہوں
یہ سب کے پاؤں پڑتا ہے میں یونہی
سمندر کو بڑا کہتا رہا ہوں
ہمیشہ کے لیے وہ بجھ گیا ہے
جسے اب تک دیا کہتا رہا ہوں
اگر رُک جائے تو احسان ہوگا
میں اس کو بارہا کہتا رہا ہوں

سفینوں کو کناروں سے رہا ہوتے ہوئے دیکھا
ہمیشہ ملنے والوں کو جدا ہوتے ہوئے دیکھا
محبت کی مجھے معصومیت پر اور پیار آیا
کہ جب ماؤں کو بیٹوں سے خفا ہوتے ہوئے دیکھا
جنہیں ہم نے تراشا تھا اُنہیں پُوجا گیا آخر
بتوں کو سامنے اپنے خدا ہوتے ہوئے دیکھا
کسی کا جرم تھا لیکن سزا پائی کسی نے یاں
کسی کا قرض اوروں سے ادا ہوتے ہوئے دیکھا
تمہارا پیار پہلے صبح کے سورج کے جیسا تھا
پھر اس کے بعد تو محشر بپا ہوتے ہوئے دیکھا
یہ وہ دل ہے بچھڑ جانے کے صدمے کو سہا جس نے
یہ وہ آنکھیں ہیں جن نے دُکھ بڑا ہوتے ہوئے دیکھا
وہ اک لمحہ جسے میں زندگی کا سمجھا تھا حاصل
وہی لمحہ محبت میں سزا ہوتے ہوئے دیکھا
مری آنکھوں میں جب احسان شاہد آ گئے آنسو
پھر اس کے بعد ہر منظر نیا ہوتے ہوئے دیکھا

سچی ہو محبت تو جدائی نہیں ہوتی
اس میں تو کوئی چیز پرائی نہیں ہوتی
رہتا ہے تری یاد سے روشن مرا کمرہ
میں نے تو کوئی شمع جلائی نہیں ہوتی
کرتی ہے محبت بھی شفایاب دلوں کو
ہر زخم کا مرہم تو دوائی نہیں ہوتی
ہم دُکھ سے رہا ہوں تو کوئی جشن منائیں
اشکوں کی رہائی تو رہائی نہیں ہوتی
آنکھوں سے لگا لیتا ہے اندازے وہ سارے
میں نے تو کوئی بات بتائی نہیں ہوتی
اُس آنکھ کا ہو جاتا ہے نشہ یونہی طاری
محفل میں کسی نے بھی پلائی نہیں ہوتی
جب تک نہ کسی اور کا ہم درد بٹا لیں
احسانؔ ہماری تو کمائی نہیں ہوتی

لبوں پہ کوئی صدا نہیں ہے
مگر تو مجھ سے جدا نہیں ہے
ہے یونہی تیری تلاش لیکن
خود آپ اپنا پتہ نہیں ہے
کدھر سے آئیں کدھر کو جائیں
کوئی بھی رستہ ترا نہیں ہے
ابھی سے راہوں میں تیرگی کیوں
ابھی تو سورج ڈھلا نہیں ہے
ابھی ہیں روشن وفا کی شمعیں
کہ دل تو شاہد بجھا نہیں ہے

شمشیر حیدر/واہ کینٹ

بنا رہا تھا پرندہ میں ایک کاغذ پر — کہ خود بھی اُڑنے لگا اس کے پر بناتے ہوئے

شمشیر حیدر کی دشت خواب پیش نظر ہے اور غزل بہ غزل ورق اُلٹتا جا رہا ہوں اور ایک خوشگوار اور مسرور کن کیفیت سے گزرتا جاتا ہوں۔ جدید تر غزل کے سارے دل آویز سلیقے شمشیر حیدر کی دسترس میں ہیں اور انہیں وہ ہنر ورانہ چابک دستی کے ساتھ بروئے کار لاتے نظر آتے ہیں۔ ہم عصروں کی تکرار بے معنی سے محفوظ اور مصنوعی تازہ کاری کی بے جان فضابندی سے گریزاں شمشیر حیدر کی شعری کائنات آپ کی توجہات کو اپنی طرف مبذول کراتی ہے اور زنجیر کر کے رکھتی ہے تو میرے نزدیک یہ بڑی بات ہے۔ (افتخار عارف)

خیال و خواب میں دیوار و در بناتے ہوئے
ہمیں تو عمر لگی ایک گھر بناتے ہوئے
عذاب دشت نوردی کا سامنا ہے مجھے
سو، ڈر رہا ہوں تجھے ہمسفر بناتے ہوئے
بنا رہا تھا پرندہ میں ایک کاغذ پر
کہ خود بھی اُڑنے لگا اُس کے پر بناتے ہوئے
وہ دکھ اُٹھائے کہ جاں سے گزر گئے ہم لوگ
عروسِ خاک تجھے معتبر بناتے ہوئے
وہ نقش پھر بھی نہ شمشیر بن سکا مجھ سے
میں آپ ٹوٹ گیا ٹوٹ کر بناتے ہوئے

شہرِ خیال و خواب میں آباد ہو گیا
اتنا اسے پڑھا کہ مجھے یاد ہو گیا
میں آج تک ہوں جس کے فریب و حصار میں
وہ اور ہی کسی کا مرے بعد ہو گیا
اندھی ہوا کا ساتھ نبھانے کے شوق میں
کوئی تباہ ہو گیا برباد ہو گیا
اپنی تو ساری عمر اسیری میں کٹ گئی
جس نے بھی ہار مان لی آزاد ہو گیا
پہلے تو پانیوں سے رہی گفتگو مری
پھر یوں ہوا کہ آئینہ ایجاد ہو گیا

دکھا کے وقت نے کرتب مداریوں والے
بھلا دیے مجھے دن بے قراریوں والے
کچھ اور اونچی اڑانوں میں لے گئے مجھ کو
یہ میرے طور طریقے پجاریوں والے
میں تجھ کو ہار کے ایسے نہ زندگی کرتا
اگر نہ حوصلے ہوتے جواریوں والے
کسی کے لمس نے مٹی کو کر دیا سونا
ہمارے ہاتھ میں کاسے بھکاریوں والے
نشانہ باز تو پہلے بھی وہ غضب کا تھا
اب آ گئے اسے گر بھی شکاریوں والے

شہرِ ستم شعار نہ زخمِ دروں سے ہوں
وحشت زدہ میں جتنا دلِ پر سکوں سے ہوں
ہجرت سے بھول سکتے نہیں اپنے بام و در
لپٹا ہوا میں آج بھی گھر کے ستوں سے ہوں
کچھ دن سے اپنے درد کا چرچا نہیں کیا
دنیا سمجھ رہی ہے کہ میں اب سکوں سے ہوں
منظر تو دلفریب ہوں میں رائیگاں نہیں
اوجھل نہ جانے کیوں تری چشمِ فسوں سے ہوں
شہرِ خرد میں واپسی آساں نہیں رہی
مانوس اتنا ان دنوں دشتِ جنوں سے ہوں
شمشیر ایسے میر کے نوحے رلاتے ہیں
لگتا ہے جیسے میں اسی شہرِ زبوں سے ہوں

دنوں سے کیسے شبوں میں ڈھلتے ہیں دن ہمارے
یہ ہم بدلتے ہیں یا بدلتے ہیں دن ہمارے
جو کٹ گیا ہے سفر ابھی تک نہیں ہمارا
خبر نہیں اور کتنا چلتے ہیں دن ہمارے
یہ کس کے جانے پہ بین کرتی ہیں چاند راتیں
یہ کس کے جانے پہ ہاتھ ملتے ہیں دن ہمارے
شبیں جہاں اپنی حکمرانی کا سوچتی ہیں
چراغ بن کر وہیں پہ جلتے ہیں دن ہمارے
جہاں سے آتی ہے مسکراہٹ ترے لبوں کی
وہیں سے ہنستے ہوئے نکلتے ہیں دن ہمارے
جوان ہو کر بھی بچپنے کا حصار کیوں ہے
ترے کھلونوں سے کیوں بہلتے ہیں دن ہمارے

میں اکیلا ہوں یہاں کوئی نہیں ساتھ مرے
کر گئے ہاتھ سبھی دشت نشیں ساتھ مرے
آسماں دیکھ رفاقت تو اسے کہتے ہیں
بوجھ اٹھا کر مرا چلتی ہے زمیں ساتھ مرے
یہ بھی تو وقت کی جانب سے ہے دلجوئی مری
ایک سے بڑھ کے رہا ایک نگیں ساتھ مرے
ایسا گھر ہوں کہ تری آگ میں جلنا چاہوں
ڈر یہی ہے کہ نہ جل جائیں مکیں ساتھ مرے
دل جو اک دشت ہے پھر شہر سا ہو جائے گا
یونہی کچھ دن جو تری یادیں رہیں ساتھ مرے
میں تو دل ہوں یہ سبھی سجدے مرے دَم سے ہیں
جب دھڑکتا ہوں تو جھکتی ہے جبیں ساتھ مرے
ڈوب جائے گی ترے وہم و گماں کی دنیا
پار جائے گا مرا صدق و یقیں ساتھ مرے

ناصر معروف/مسقط

میں کیوں نفرت کروں دشمن سے اپنے
وہ میرے زہر سے پلتا رہے گا

ممتاز شاعر ناصر معروف کا تعلق ساہیوال سے ہے۔تاہم بسلسلہ روزگار وہ گزشتہ کئی برسوں سے مسقط میں مقیم ہیں۔وہ غزل اور نظم کے بہترین شاعر ہیں۔ان کے اب تک تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ان کے شعری مجموعے ''تیری آرزو ہی رہی'' کو ادبی اور عوامی حلقوں میں کافی پذیرائی ملی۔وہ عمان میں سوشل کلب آف عمان کی لٹریری ونگ کے عہدیدار ہیں۔وہ سادہ آسان اور شگفتہ انداز میں نہایت دل پذیر شاعری کرتے ہیں۔اُن کی شاعری کی طرح ان کی شخصیت بھی پرکشش ہے۔(ارژنگ)

محبت کا دیا جلتا رہے گا
اندھیرا ہاتھ ہی ملتا رہے گا
میں کیوں نفرت کروں دشمن سے اپنے
وہ میرے زہر سے پلتا رہے گا
کسی چڑیا نے مر جانا ہے پھر سے
اگر پنکھا یونہی چلتا رہے گا
توقع پر رکھیں گی اس کی آنکھیں
ارادہ پھولتا پھلتا رہے گا
ہے سورج کی طرح ہی بخت سب کا
کبھی چڑھتا کبھی ڈھلتا رہے گا
یہ دنیا ہے یہاں معروف صاحب
یونہی کھوٹا کھرا چلتا رہے گا

مرے قافلے کے جو لوگ تھے انھیں رنج مال و منال تھا
فقط ایک میں ہی بچا رہا جسے صرف تیرا خیال تھا
ترے انتظار کے شہر میں، مرے ماہ و سال گزر گئے
مگر اپنی فکر نمود میں تجھے کب کسی کا خیال تھا
سر کوئے شوق گزر گئی اسی کیفیت میں یہ زندگی
نہ زباں پہ تھا کوئی مدعا نہ نظر میں کوئی سوال تھا
سر بزم اور بھی لوگ تھے تری اک نگاہ کے منتظر
یہ بتا وفا کے نصاب میں کوئی شخص میری مثال تھا

کبھی لب پہ شعلہ حرف تھا کبھی دل کا شعلہ بھی برف تھا
ترا قرب اپنی جگہ مگر یہ فراق تھا کہ وصال تھا

وہ مجھ کو نغمے سنا رہا ہے خیالوں میں مسکرا رہا ہے
میں اس کو دیکھوں وہ مجھ کو دیکھے نگاہوں میں جگمگا رہا ہے
حیا کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں حسین رعنائیوں کے شعلے
میں اس کو جو آزما رہا ہوں مجھے وہ بھی آزما رہا ہے
یہ ضبط غم کی پہاڑ راتیں کہ دل کو دل سے ہزار باتیں
مرے ہی خوابوں میں آ کے کوئی مرے ہی دل کو ستا رہا ہے
وہ میری چاہت کی داستانیں حسین تھیں، حسین شامیں
فروزاں شمعیں نہ پہلے کم تھیں، حسین تر وہ بنا رہا ہے
وہاں وہ خوش ہیں کہ دلنشیں ہیں یہاں میں خوش کہ مری محبت
کوئی جو ہے دل فریب جذبہ حدوں سے آگے بڑھا رہا ہے
کہوں میں کیا اپنا حال ناصر اُسے تو دل کی خبر ہے ساری
اسی لیے تو وہ رات بھر سے مجھے ابھی تک منا رہا ہے

زندگی تیرے ہیں اسرار بہت
وقت کے بھیس میں کردار بہت
کشتیاں ڈولتی ہی رہتی ہیں
پھر بھی جاتے ہیں اُتر پار بہت
آنکھ کے کھلتے ہی سب بھید کھلے

آزمائش کے ہیں انبار بہت
تیرے چکر میں غم دوراں کے
اپنی جاں پر ہو چکے وار بہت
اک مسیحا کی میں رہ دیکھتا ہوں
کون کہتا ہے کہ ہیں یار بہت
حوصلے وقت نے بھی دیکھے ہیں
عشق میں لٹکے سر دار بہت
آزماتے رہے اک دوسرے کو
کون ہے ہم میں وفادار بہت

میری یادوں سے گزارا کرنا
تم نہ خلوت کو گوارا کرنا
یاد آتا ہے بہت وہ لمحہ
تیرا آنکھوں کا اشارہ کرنا
اُلجھنیں یاد جو آئیں میری
تم دعاؤں کو سہارا کرنا
میرے دل کی ہے یہی اک خواہش
ہر خوشی کو ہے تمہارا کرنا
عکس جو دیکھنا چاہو اپنا
میری آنکھوں کا نظارا کرنا
حال جیسا بھی ہو تیرا ناصر
اپنے رب کو ہی پکارا کرنا۔

سبیلا انعام صدیقی / کراچی

ہم سفر ایسا ملے جو ہم نوا بھی ہو مرا
قربتیں ہوں جس کی مرہم غم کے درماں کے لیے

کس قدر دل سوز ہیں لمحے یہ انساں کے لیے
دوست ہی در پے ہیں اب چاک گریباں کے لیے
لے گئی آندھی اُڑا کر صبر کے سب بادباں
کشتی دل منتظر ہے جیسے طوفاں کے لیے
ہر جگہ شیطان دیکھے روپ میں انسان کے
کوئی چارہ گر ملے قلب پریشاں کے لیے
وحشتیں اور دہشتیں سب کرب کے ہیں سلسلے
کیا تدارک کچھ نہیں ہے شہر ویراں کے لیے
اک بھیانک خواب دیکھا ڈس لیا تھا سانپ نے
زہر سی تعبیر پائی ہے دل و جاں کے لیے
ہم سفر ایسا ملے جو ہم نوا بھی ہو مرا
قربتیں ہوں جس کی مرہم غم کے درماں کے لیے
پھول، خوشبو اور بہاروں نے سبیلاؔ یہ کہا
ہے رواں بادِ صبا تیرے ہی ارماں کے لیے

پلٹ کے اُس نے جو دیکھا نگاہ بھر کے مجھے
بچھڑ نہ جائے کہیں اشک بار کر کے مجھے
روائیں بہنوں کی لٹتی یہاں پہ دیکھی ہیں
کہ لوگ وحشی سے لگتے ہیں اس نگر کے مجھے
منافقت سے بھرا سارا یہ زمانہ ہے
ملیں کہاں سے نشاں سچے راہبر کے مجھے
اندھیرا راتوں کا دلگیر ہو کے کہتا ہے
نشاں کوئی تو دکھائے نئی سحر کے مجھے
جو اُبھرے فکر بصیرت سلام کرتی ہے
جواب دیتی ہے سارے اگر مگر کے مجھے

بری نہ رکھی کبھی سوچ بھی کسی کے لیے
تو چھوڑ جاتے ہیں سب کیوں اُداس کر کے مجھے
نہیں تھی قدر سبیلاؔ جسے خلوص کی بھی
خدا سے مانگتا ہے آج وہ بکھر کے مجھے

وہ اس ادا سے دعا کرے گا
ہمارا ہو کر رہا کرے گا
عطا کرے گا اگر وہ مالک
وہ دل کی دھک دھک ہوا کرے گا
ہے راس دل کو اداس موسم
کہ دکھ کو دل ہی سہا کرے گا
مرا وہ دلدار لوٹ آئے
ملول ہو کر کہا کرے گا
اٹھی ہو سکی کسی کے دل سے
ڈرو کے وہ دل صدا کرے گا
کسک اُٹھے گی ہمارے دل سے
کسی سے گر وہ ملا کرے گا
وہ کھائی ٹھوکر ہے روح گھائل
ہے درد کوئی دوا کرے گا

دل کا میرے درد ہی دل سے فنا ہو جائے گا
گر رفاقت ' تری کچھ آسرا ہو جائے گا
چاندنی راتوں کی مستی اور ہواؤں کا یہ شور
تیری آمد سے یہ منظر دلرُبا ہو جائے گا
بہہ گئے سیلاب میں جتنے بھی بارونق مکاں
کیا کبھی روشن وہاں کوئی دیا ہو جائے گا
دوستی کی آڑ میں کرتے ہیں جو ہم سے دغا
دیکھتے ہیں ان کا قد کتنا بڑا ہو جائے گا
پیار کی یہ بیڑیاں ہی قید کرتی ہیں مجھے
روتے روتے ایک دن یہ دل رہا ہو جائے گا
تو ہے منصف اے خدا تجھ پر ہی چھوڑا فیصلہ
کیا بُرا کر کے مرا اُس کا بھلا ہو جائے گا
خود غرض پیاری سبیلاؔ اس جہاں کے لوگ ہیں
کیا خبر کب، کون بدلے اور کیا ہو جائے گا

کس کو بتاتے کس سے چھپاتے سراغ دل
چپ سادھ لی ہے، زخم کھایا نہ داغ دل
جب راکھ بن گئے تو کہا یہ حریف نے
جل جل کے وہ جلاتے رہے ہیں چراغ دل
کرتی نہیں بیان غم جاں کی داستاں
بس خود سے ہم کلام ہوا ہے دماغ دل
گزرے ہماری زیست کے ایام اس طرح
قلب و نظر سے جام پلاتے ایاغ دل
چاہت کی دل میں کوئی بھی حسرت نہیں رہی
پھر بھی ہے اس کی یاد سے سرسبز باغ دل
رکھتی نہیں سبیلاؔ کبھی عیب پر نظر
مصروف پیار میں رہا اس کا فراغ دل

احمد عدنان طارق/فیصل آباد

آپ بیتی

پس آئینہ یک بارگی میری چشم نم نے دیکھا
وہ بڑھاپے کی ماری عورت
جو پس آئینہ اک چہرہ لیے بیٹھی ہوئی تھی
چہرہ جس پر شکنیں تھیں، خلجان تھے
خلش تھی، فقدان تھے
کچھ گزرے ہوئے طوفان تھے
جھریوں کی دبیز تہہ میں کہیں میرا ماضی چھپا بیٹھا ہوا تھا
ان جانے چہرے میں مَیں تم کو کھوجتی تھی
جھریوں کی ایک ترتم بھی تو دے گئے تھے
یہ چہرہ سکیڑتے ہی میں تم کو سوچتی تھی
تم آتے تو میرے چہرے پر ہیجان ناچتا تھا
جاتے تو چہرے پر خلفشار دے کر جاتے
دیکھو کتنے سالوں میں تم نے میرا یہ چہرہ بنا دیا ہے
ہیجان و خلفشار سے اس کو سجا دیا ہے
جھریوں کی ایک تارتم بھی تو دے گئے تھے
تم سے بھی پہلے میں نے اس چہرے کو ہے کھوجا
مجھے پیدا کرنے والے دونوں جو بچپن میں چل بسے تھے
دیکھو یہ ان کی لائن آنکھوں کے نیچے بہتی
میرے بچوں کی دیکھو یادیں
میری ہنستی ہوئی یہ جھریاں میں ان کو پوجتی تھی
وہ ٹیڑھا میڑھا چلنا کیا میں کچھ اور مانگتی تھی
پھر ٹیڑھا میڑھا چلنا شراب کے نشے میں
چوکھٹ پہ سر کا رکھنا بیٹا تیرا انتظار کرنا
بیٹا! یہ ہنستی روتی جھریاں
یہ تم ہی تو دے گئے تھے
وہ میری پیاری بیٹی
وہ کومل سی ایک شہزادی
اپنا ہی عکس اس میں گویا پانی میں دیکھتی تھی
تم کو چھپا کر رکھنا
اپنی عبا میں رکھنا
جب تم نے مجھ کو چھوڑا کئی جھریاں تب بنی تھیں
مکڑے نے اپنے جال کی مجھ میں رسیاں تنی تھیں
میرے اپنے گناہوں کی جھریاں میں رب کو سوچتی تھی
تھا قصور صرف اتنا میں سب کو سوچتی تھی
اب چہرہ کیسے ڈھونڈوں ہیں کئی چہرے ساتھ میرے
یہ اولڈ ہوم میرا جس میں اب میں رہ رہی ہوں
کچھ اور جھریوں والے یہاں آئینہ جھانکتے ہیں
جھریوں میں اپنی یادیں، یوں روز تاکتے ہیں

درختوں پر لکھے نام

دریا کے کنارے پر رکھی دس کرسیاں
اور میرے کندھے پر چیک دار رومال
اوئے چھوٹے کی آوازیں
چھٹے کا لالچ اور بھنبھناتے لوگ
اور یہ گونجتی آوازیں
یہ شاموں کا حزن ہے کیا
یا راتوں کا سوگ
چائے کے گگ مجھ سے محبت کیا کرتے ہیں
دس سال کی عمر میں
مجھ پر کوئی قرض دھرتے ہیں
میری راہ تکتے ہیں
میرے دریا کی طرح ہی شوریدہ ندیاں
موجوں کو ذبح کرتی ہیں
یہ پاس آنے والوں کو حسن اتنا دیتی ہیں
وہ عشق گویا قربان اور یہ رہتی ہیں
موجیں ہیں کہ سینوں کا تلاطم ہیں یہ
اور دریا کنارے کتنے ہی لوگ بسا کرتے ہیں
اور ساتھ بنے کمروں کو گندہ کیا کرتے ہیں
شاید موجوں کا زور سہہ سکتے نہیں وہ
لوگ آتے ہیں چلے جاتے ہیں
چند ساعتوں کو بہتے ہیں
عمر بھر موجوں کے ساتھ بہہ سکتے نہیں وہ
وہ ہم کو پیدا کرتے ہیں نشانی کے طور پر
جیسے درختوں پہ نام لکھ دے کوئی سیر کے دوران
ہم ملتے ہیں کونوں کھدروں میں
انہی تاریک شکل کمروں میں
اس دریا کنارے ڈھابے نے اپنا لیا تھا مجھ کو
بیٹا بنا لیا تھا مجھ کو
میں سوچتا ہوں کل
کوئی مجھ کو کھروچ لے گا
پوچھے گا یہ درختوں پہ نام کون لکھتا ہے
کون ہے جو آج اتنے سستے میں بکتا ہے
میں بول دوں گا اُس کو
میں تو قرض اُتارتا ہوں
جس نے مجھ کو لکھا بس اُس کو پکارتا ہوں

ادبی خبریں/تقریبات

تعزیت

پاکستانی ادبی دنیا کے معروف نثر نگار، کالم نگار، شاعر اور ماہر تعلیم جناب احمد عقیل روبی قضا الٰہی سے وفات پا گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین ادارہ ارژنگ لواحقین کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

تعزیت

ملک کے مشہور شاعر، نعت خواں پروڈیوسر کرنٹ افیئر پی ٹی وی لاہور مرکز کے جناب علی رضا کی والدہ محترمہ مشیت الٰہی سے رحلت فرما گئیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے علی رضا کو اس ناگہانی صدمہ کو برداشت کرنے کی توفیق و ہمت عطا کرتے ہوئے والدہ مرحومہ کو جنت میں ارفع مقام عطا کرے۔ آمین ارژنگ کا پورا عملہ علی رضا کے غم میں برابر شریک ہے۔

تعزیت

ملک کے معروف فی البدیہہ شاعر اقبال راہی کے جواں سال صاحبزادے طویل علالت کے بعد قضائے الٰہی سے وفات پا گئے۔ انا للہ وانا علیہ راجعون۔ غم کی اس اندوہ ناک گھڑی میں ادارہ ''ارژنگ'' اقبال راہی کے غم میں برابر شرکت کرتے ہوئے مرحوم کی مغفرت اور پسماندگان کے لیے صبر وجمیل کے لیے دُعا گو ہے۔

تعزیت

پچھلے دنوں ملک کے مشہور شاعر جناب لطیف ساحل کی زوجہ محترمہ ناگہانی وفات پا گئیں۔ ادارہ ارژنگ مرحومہ کے لیے دعا گو ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرتے ہوئے خلد بریں میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آمین ادارہ لطیف غم کے غم میں برابر شریک ہے۔

تعزیت

ماہنامہ ارژنگ کے مستقل قاری اور ممبر جناب میجر (ریٹائرڈ) خالد نصر کی والدہ محترمہ قضا الٰہی سے انتقال کر گئیں۔ یہ سانحہ خالد نصر کے لیے یقیناً صدمہ سے کم نہیں۔ ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ اور سوگواران کو صبر وجمیل عطا فرمائے۔ ادارہ ارژنگ اُن کے کے غم میں شامل ہے۔

تعزیت

ممتاز شاعر جناب شوکت مہدی پچھلے دنوں راہی عدم کو عازمِ سفر ہوئے۔ مرحوم ساری زندگی ادب کی آبیاری میں ہمہ تن مصروف رہے۔ ادبی حلقوں میں ان کا نام ایک معتبر حوالہ تھا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آمین ادارہ ارژنگ پسماندگان کے غم میں برابر شریک ہے۔

عامر بن علی کے اعزاز میں مشاعرہ

(رپورٹ: مظہر بخاری) جاپان میں مقیم معروف مترجم، شاعر، کالم نگار اور ماہنامہ ادبی جریدہ ارژنگ کے چیف ایڈیٹر عامر بن علی میاں چنوں تشریف لائے تو ان کے اعزاز میں ایک بھرپور محفل مشاعرہ انہی کی صدارت میں منعقد کی گئی۔ جس میں میاں چنوں کے شعراء نے بھرپور شرکت کی۔ اس محفل مشاعرہ میں عامر بن علی، مظہر بخاری، ظفر اقبال سجن، سہیل انجم شہزاد، انور علی انور، مصطفیٰ انور، عدنان آصف بھٹہ، نوید اقبال آکاش، حنیف عاصم اور سعید اختر سعید نے اپنا کلام پیش کیا۔ شعراء کے کلام سے انتخاب:

حسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے
(عامر بن علی)

کمال عشق ہے صحرا میں دھول ہوتے ہوئے
رواں دواں ہیں مسافر ببول ہوتے ہوئے
(مظہر بخاری)

اپنے دکھڑے اپنے اتے جالی دے
لوکاں نوں نئیں دل دے پھٹ وکھالی دے
(ظفر سجن)

ہم سے ملیں سنبھل کے تکبر پسند لوگ
ہم وہ ہیں جن کے پاؤں ہمالہ پڑا رہا
(سہیل انجم شہزاد)

انور کو اُلٹیں تو رونا بنتا ہے
اب میں سمجھا ہوں انور کی بے ربطی
(انور علی انور)

سر تے آن بنی تے سانجھی ساہواں دے
ہتھاں وچوں ہتھ چھڑا کے ٹر گئے نیں
(مصطفیٰ انور)

ہم کو مطلوب ہیں کچھ فیصلے جلدی جلدی
کرۂ ارض ذرا تیز گھمایا جائے
(عدنان آصف)

آخر میں مظہر بخاری نے سہیل انجم شہزاد کے چچا اور نوید اقبال آکاش کی والدہ کی وفات پر ایک تعزیتی قرارداد پیش کی۔ بعدازاں مرحومین کے لیے دُعائے مغفرت اور لواحقین کے لیے صبر جمیل کی دعا کی گئی۔

فیصل نواز چوہدری کے اعزاز میں تقریب

اوسلو (ناروے) سے آئے ہوئے معروف افسانہ نویس، سفرنامہ نگار فیصل نواز چوہدری کے ساتھ خصوصی نشست کا اہتمام امن اور انسانیت فورم نے کیا۔

صدارت امن اور انسانیت فورم کے صدر رانا احتشام ربانی نے کی۔ ان کے ساتھ فیصل نواز چوہدری اور فورم کے سیکرٹری اطلاعات تنویر ظہور بیٹھے تھے۔ نظامت کے فرائض حکیم سلیم اختر ملک نے ادا کیے۔ تلاوت قران مجید کی سعادت خورشید کمال نے حاصل کی۔ تلاوت کے بعد انہوں نے اپنا کیا ہوا منظوم پنجابی ترجمہ بھی سنایا۔

محمد علی چراغ نے اپنے خطاب میں کہا کہ فیصل نواز چوہدری گزشتہ 39 برسوں سے ناروے میں مقیم ہے۔ ناروے میں رہتے ہوئے مسلسل تصنیف و تالیف کرتا رہا۔ ''یادیں'' اس کی چوتھی کتاب اور ادبی سرمایہ حیات کا ایک مجموعہ ہے۔ فیصل نواز چوہدری بنیادی طور پر کہانی کار ہے۔ اسے چھوٹی چھوٹی باتوں پر کہانیاں لکھنے کا خوب سلیقہ ہے۔ فیصل نواز چوہدری کی ہر تحریر میں اپنے وطن عزیز کی مٹی کی سوندھی سوندھی باس بہرصورت موجود رہتی ہے۔ تنویر ظہور نے کہا کہ فیصل نواز چوہدری سے ٹیلی فونک رابطہ 2004ء میں ہوا۔ یہ رابطہ پختہ ہوتا گیا۔ ان کے سفرناموں اور افسانوں کے دو دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اس سے ان کی تحریروں کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ فیصل نواز، ہنرک ابسن ایوارڈ کمیٹی ناروے کے چیئرمین بھی ہیں۔ اس کے تحت پاکستان سے کرنل الیاس، امجد اسلام امجد اور تنویر ظہور کو ہنرک ابسن (Henrik Ibsen) ایوارڈ دیے جا چکے ہیں۔ ہنرک ابسن ناروے کا ڈرامہ نگار تھا جس کو جدید ڈرامے کا بانی کہا جاتا ہے۔ وہ ان روایات کے علمبردار ہیں جو ناروے میں اچھی ہیں۔ ان کے افسانے بہت اچھے ہیں خاص طور پر جو ناروے کے پس منظر میں لکھے گئے۔

اقبال راہی نے فیصل نواز چوہدری کو منظوم خراج پیش کیا۔ ایک قطعہ ملاحظہ کریں:

ان کی تحریر کے ہیں ہم قاری
اک تعلق ہے ان کے نام کے ساتھ
اپنے فیصل نواز اے راہی
آن بیٹھے ہیں احتشام کے ساتھ

مہمان خصوصی فیصل نواز چوہدری نے اپنے خطاب میں کہا کہ میں پاکستان سے مایوس نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سال میں دو مرتبہ پاکستان آتا ہوں۔ میں نے اپنے افسانوں میں سچ بیان کیا ہے۔ حال ہی میں میری کتاب ''یادیں'' شائع ہوئی ہے۔ اس میں وہ تمام تحریریں اور تصویریں شامل ہیں جو میرے بارے میں دنیا کے مختلف اخبارات و جرائد میں شائع ہو چکی ہیں۔ آخر میں انہوں نے اپنے افسانے سنا کر بے پناہ داد حاصل کی۔ امن اور انسانیت فورم کی طرف سے رانا احتشام ربانی نے فیصل نواز چوہدری کو ایوارڈ پیش کیا۔ تقریب میں معروف شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں نے شرکت کی جن میں چند نام یہ ہیں۔ پروفیسر رمضان شاہد، نجیب احمد، روبیہ جیلانی، توقیر احمد شریفی، مجید غنی، رفیق چوہدری، سید فراست بخاری، افضال عاجز، محمد شعیب مرزا، شفیق رائے و دیگر۔

اعتراف انٹرنیشنل کے زیراہتمام ''جگنو وچ ہنیرے'' کی تقریب پذیرائی

''اعتراف انٹرنیشنل'' کے زیراہتمام اُردو، پنجابی کے نوجوان شاعر عقیل شافی کے شعری مجموعے ''جگنو وچ ہنیرے'' کی تقریب پذیرائی 23 نومبر 2014ء اتوار کو الحمراء ادبی بیٹھک مال روڈ لاہور میں ہوئی۔ صدارت ڈاکٹر ناصر رانا نے کی۔ مہمانانِ خصوصی و اعزاز میں حسن عباسی پروفیسر عاشق رحیل، نادرا خیال، حکیم سلیم اختر، پروفیسر ظہیر احمد ظہیر تھے۔ تلاوت حافظ ظفر اقبال

نے کی اور نعت رسول مقبولؐ خالد خورشید، قاری محمد یونس نے پڑھ کر تقریب کا آغاز کیا۔ اظہارِ خیال کرنے والوں میں ناز اوکاڑوی، ڈاکٹر میاں ظفر مقبول، انیس احمد، سید انور ناز، پروفیسر ڈاکٹر ارشد اقبال ارشد، وسیم اعجاز شامل تھے۔ منظوم خراج پیش کرنے والوں میں ساجد پریمی، سید فراست بخاری، صادق شاہین، وحید ناز، شاہد عباسی، شریف فیاض، مظہر جاوید حسن، سید جعفر پیرزادہ، شوکت علی شوکت، مقصود آزاد، چوہدری کرم علی کیفی، عمران سلیم، عدل منہاس لہوری، ہمایوں پرویز شاہد، اقبال راہی نمایاں تھے۔ پروگرام کے آغاز میں علامہ فقیر اثر انصاری کی طرف سے صاحب کتاب عقیل شافی کو پروفیسر عاشق رحیل کے ہاتھوں ''جناح'' کیپ پہنائی گئی۔ ڈاکٹر ابرار احمد کی خوبصورت کمپیئرنگ نے پروگرام کو چار چاند لگائے رکھے۔ لاہور اور دیگر شہروں سے بے شمار ادبی تنظیموں کے سرپرست اعلیٰ اور کارکنان نے بھرپور شرکت کر کے پروگرام کو رونق بخشی۔ ''عشق لہر'' ادبی انجمن کے صدر اقبال فاروق قادری کی طرف سے پرنٹ پین تقسیم کیے گئے۔ آخر میں مہمانانِ خصوصی و اعزاز نے صاحب کتاب کی علمی ادبی کاوش کا سراہا اور کامیاب پروگرام پر مبارک باد دی۔

> نئی نسل کی بہتر تربیت کے لیے بچوں کے ادب پر توجہ دینا ضروری ہے۔
> (امجد اسلام امجد)

کسی بھی معاشرے کی ترقی اور فلاح کے لیے اس کے بچوں کی عمدہ تربیت اور کردار سازی نہایت اہم ہے اور یہ فریضہ والدین اور اساتذہ کے علاوہ بچوں کے ادیب خصوصی طور پر ادا کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ہر سطح پر بچوں کے ادب پر خصوصی توجہ دینی چاہیے اور بچوں کے لیے ایسا ادب تخلیق کرنا چاہیے جو ان کی تفریح کے ساتھ ساتھ ان میں جذبہ، ہمت، خود اعتمادی اور نئے جہانوں کی تسخیر کی اُمنگ پیدا کر سکے۔ ان خیالات کا اظہار اکادمی ادبیات اطفال اور پاکستان چلڈرن میگزین سوسائٹی کے اشتراک سے سیمینار ''بچوں کا ادب ماضی، حال اور مستقبل'' میں معروف شاعر و ڈرامہ نگار امجد اسلام امجد نے بطور صدر خطاب کے دوران کیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر بچوں کو فطرت سے آشنا کر دیں تو ان میں نفرت اور شدت پسندی پیدا نہیں ہوگی اور معاشرے کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔ مہمان خصوصی ممتاز ادیب اور براڈ کاسٹر ابصار عبدالعلی نے کلیدی مقالے میں کہا کہ سینئر ادیبوں کو بچوں کے لیے لکھتے ہوئے شرمساری محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ ماضی کے تمام بڑے ادیب بچوں کے لیے خصوصی طور پر لکھا کرتے تھے۔ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے بھی بچوں کے لیے لکھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ ادیب قابل تعریف ہیں جو بچوں کے لیے ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ اس وقت بھی بچوں کے لیے عمدہ ادب تخلیق کیا جا رہا ہے۔ پاکستان چلڈرن میگزین کے صدر اور ایڈیٹر پھول محمد شعیب مرزا نے کہا کہ حکومت دیگر شعبوں کی طرح بچوں کے ادب پر بھی توجہ دے تو معاشرے میں خوشگوار تبدیلیاں پیدا ہوں گی۔ انہوں نے کہا کہ حکومت کو چاہیے کہ بچوں کے ادیبوں کی سرپرستی کرے اور ان کی تربیت اور صلاحیتوں کے بہتر اظہار کے مواقع فراہم کرنے کے لیے ہر ممکن تعاون کرے۔

اکادمی ادبیات اطفال کے وائس چیئرمین معروف مزاح نگار حافظ مظفر محسن نے کہا کہ سرکاری اداروں میں بچوں کے ادب سے بے اعتنائی کی وجہ سے اکادمی کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس کا مقصد بچوں کے ادیبوں کی ترتیب و رہنمائی اور فلاح و بہبود ہے۔ اس کے علاوہ ہر سال بچوں کے لیے عمدہ ادب تخلیق کرنے پر بچوں کے ادیبوں کو ایوارڈز بھی دیے جائیں گے۔ سیمینار میں ملک بھر کے مختلف شہروں سے ادیبوں نے شرکت کی۔ کمپیئرنگ کے فرائض شرمین قمر نے انجام دیے۔ اس موقع پر بچوں کے ادب کے لیے اہم خدمات پر امجد اسلام امجد کو ''صوفی تبسم ایوارڈ'' ابصار عبدالعلی کو ''سید امتیاز علی تاج ایوارڈ'' اور نذیر انبالوی کو سید نظر زیدی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ آخر میں تمام شرکاء میں اسناد تقسیم کی گئیں۔

مہرال قمر نے بچوں کی نمائندگی کرتے ہوئے بتایا کہ بچے کے ساتھ ادب پڑھنا چاہتے ہیں اور ادیبوں کو بچوں کے لیے کیسا لکھنا چاہیے۔ سیمینار میں نوجوان اہل قلم کے علاوہ اہم علمی ادبی و صحافتی شخصیات نے بھی شرکت کی۔

جمیل یوسف کی اُردو نثر پر ایم فل کا مقالہ

ممتاز شاعر، سفرنامہ نگار اور نقاد جناب جمیل یوسف کی اُردو نثر پر مقالہ، مقالہ نگار طیبہ گل نے ''جمیل یوسف کی اُردو نثر کا جائزہ'' کے عنوان سے

مکمل کر لیا ہے۔ یہ مقالہ ڈاکٹر زاہد منیر عامر پروفیسر شعبہ اُردو کے زیرِ نگرانی مکمل ہوا ہے۔ اس سے قبل علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ارشد محمود ارشد نے جمیل یوسف کی غزل پر ایم فل کا مقالہ لکھا ہے جسے نستعلیق مطبوعات لاہور نے اہتمام سے شائع کیا۔

حضرت سید عبدالحمید پھل آ گروی اور حضرت سید رمضان شاہ قادری کے سالانہ عرس

(رپورٹ: عقیل شانی) حضرت سید عبدالحمید پھل آ گروی اور حضرت سید رمضان شاہ قادری کے سالانہ عرس مبارک پر اُردو پنجابی محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ صدارت اعجاز فیروز اعجاز نے کی۔ مہمانانِ خصوصی میں امین ایمی، ندیم شیخ تھے۔ سٹیج سیکرٹری کے فرائض عقیل شانی نے ادا کیے۔ جن شاعروں نے کلام پڑھا ان میں فرزند گرداسپوری، ساجد پریمی، خالد کلیار، شوکت علی شوکت، صلاح الدین ایوبی، شاہد عباسی، محمد اشرف محمد، قاری عبدالرحمٰن، سرفراز زمانی نمایاں تھے۔

شاعر عدل منہاس لہوری دی کتاب ''ہنجو نذرانے'' دی مکھ وکھالی

(رپورٹ: عقیل شانی) پنجابی دے معروف شاعر عدل منہاس لہوری دی کتاب ''ہنجو نذرانے'' دی مکھ وکھالی پنجابی ادبی سنگت ناصر باغ چوپال وچ ہوئی۔ صدارت بابا نجمی ہوراں کیتی۔ اُچیچے پروہنیاں وچ شفیق قریشی، ڈاکٹر یونس احقر ہوریں سن۔ عدل ہوراں دی شاعری تے شخصیت بارے عباد نبیل شاد، ناز اوکاڑوی، ڈاکٹر ارشد اقبال ارشد، سید انور ناز، پروفیسر عاشق رحیل ہوراں گل بات کیتی۔ صادق شاہین، عارف شاد، فراست بخاری، اقبال راہی ہوراں منظوم کلام راہیں صاحب کتاب نوں شاباش دتی۔ پروگرام دے شروع وچ ناز اوکاڑوی تے عقیل شانی نے عدل منہاس لہوری ہوراں نوں مالا تے گلے پوا کے لاڑا بنا کے سٹیج تے بٹھایا۔

تحقیقی کتاباں تے ایوارڈ

(رپورٹ: محمد انیق گوہر، خضر عقیل) 28-09-14 اتوار نوں شاخ ادب فیض پور ولوں 2013ء وچ چھپیاں اُردو، پنجابی، نثری، شاعری، تحقیقی کتاباں تے ایوارڈ دتے گئے۔

پروگرام دا اغاز علامہ فضل حق خاں گلشن ہوراں تلاوت کلام پاک نال کیتا تے عبدالرحمٰن چشتی صابری ہوراں نعت مبارک نال بیٹھے مسلماناں دے سینے منور کیتے۔

صدارت سردار ارشد ڈوگر، چیف ایڈیٹر ''نوائے ڈوگر'' سن، اُچیچے پروہنیاں وچ احسان باجوا، قمر حجازی تے پروفیسر ڈاکٹر ارشد اقبال ارشد ہوریں سن۔ عقیل شانی ہوراں بڑے سوہنے ڈھنگ نال اپنے فرائض سرانجام دتے۔ جنہاں کتاباں دے لکھاریاں نوں ایوارڈ ملے اوہناں دے ناں اینج نیں۔

(۱) ''آ ساں'' الحاج نذیر احمد نذیر (منڈی فیض آباد)
(۲) ''من پسند کہانیاں'' حاجی محمد لطیف کھوکھر (لاہور)
(۳) ''آنسو ہم سفر میرے'' ساجن انصاری (فیروز وٹواں)
(۴) ''الف دا پاندھی'' صابر علی صابر (پانڈوکی)
(۵) ''سچ بانی'' احسان باجوا (گکھڑ والی)
(۶) ''جو بھی تو ہے'' رفیق کاشمیری (اوکاڑہ)
(۷) ''شجرہ خاندان کھوکھر'' حاجی قاری محمد منشا شہزادہ (بیگم کوٹ)
(۸) ''باسے ونڈی دے'' ڈاکٹر سعید اُلفت لاہور
(۹) ''عشق پریتاں'' گل زیب عباسی (بہاولنگر)
(۱۰) ''صادق سے نذیر'' احسان فیصل کنجاہی (راولپنڈی)
(۱۱) ''تاریخ اُم القریٰ'' محمد عمر ندیم (منڈی بہاؤالدین)
(۱۲) ''سسی پنوں دی حرفی دیگر'' ڈاکٹر میاں ظفر مقبول (لاہور)
(۱۳) ''ماہنامہ نوائے ڈوگر'' (سردار ارشد ڈوگر (پرانی بھینی)

پروگرام دے آخر تے مرحوم شاعراں تے ملک و قوم واسطے دعائے خیر کیتی گئی۔ کئی دوستاں ونگی دے طور تے اپنے اپنے کلام دا نمونہ وی پیش کیتا۔ بابا فقیر اثر انصاری، عبدالجبار اثر، غلام عباس ستار، عبیداللہ عربی، سردار محمد عبداللہ ہوراں ہر آن والے پروہنے نوں ان پانی تے عزتاں نال نوریا۔

تنویر ظہور کی پنجابی ادبی خدمات پر روبینہ کرمانی کا تحقیقی مقالہ

لاہور (پ ر) لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی کی ایم ایس کی طالبہ روبینہ کرمانی نے ''تنویر ظہور دیاں پنجابی ادبی خدمتاں'' پر تحقیقی مقالہ لکھا۔

ایم ایس کی ڈگری کے لیے یہ مقالہ انہوں نے ڈاکٹر ثریا احمد ایسوسی ایٹ پروفیسر لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی کی زیرِ نگرانی رقم کیا۔ 220 صفحات پر مشتمل اس تحقیقی مقالے کو دو سال میں مکمل کیا گیا۔

تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب: نیاز (مجموعہ نعت)/شاعر: محمد حنیف نازش قادری/ قیمت: 400 روپے/فلیپ نگار: ڈاکٹر ریاض مجید

ناشر: نعت مرکز-55-روز سنٹر بالمقابل الفلاح بنک، کبیر سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور 0345-4320072

حنیف نازش معاصر نعتیہ شاعری کے منظر نامے کی وہ نمایاں شخصیت ہیں جنہوں نے (اُردو اور پنجابی نعت میں بھی) اس نازک صنف سخن کے فکری اور موضوعاتی اظہار میں اس کی فنی نزاکتوں کا بھی خیال رکھا ہے۔ انہوں نے آج کی نعت کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔ وہ الفاظ کے دروبست، تراکیب اور بحور میں نادرہ کاری کی شناخت کا کئی دوسرے نعت گو شاعروں سے زیادہ شعور رکھتے ہیں۔ نعتیہ امور پر ان سے گفتگو کرتے ہوئے ہمیشہ بہجت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی نعت دوست شخصیت نعت کے فروغ میں ہمہ وقت منہمک رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نعت گوئی میں نعت کی فنی پختہ کاری اور وارورت کے حصول کی طرف ایک مسلسل ریاضت اور جبلی لپک نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری کا ایک حصہ یقیناً آج کی نعت کے مرکزی دائرے سے عبارت ہے۔ اس اثاثۂ نعت میں معاصر نعت گوئی میں استعمال ہونے والا ذآخیرہ الفاظ، معروف و مستعمل تراکیب، بحور اور نعتیہ زمینوں کا اعادہ اور عکاسی نظر آتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کی نعت گوئی میں پختہ کاری اور کرافٹ پر وہ توجہ بھی نظر آتی ہے جسے میں نے اوپر کی سطروں میں جبلی لپک سے تعبیر کیا ہے۔

ان کے زیر نظر مجموعہ نعت میں ایسی بے مثال مثالیں ملتی ہیں جن میں وہ اس صنف کو بڑھاوا دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ نعت کاران کے حلقے میں (نیاز) کا خوش دلی سے خیر مقدم کیا جائے گا۔ یہ کتاب جہاں حنیف نازش قادری کی نعت گوئی کی ترجمان ہے وہاں نعت مرکز کی نعت سے وابستگی اور اس صنف کو آگے بڑھانے کے لیے لگن کی عکاس بھی نظر آتی ہے۔ انہوں نے گزشتہ دنوں اُردو نعت کے دور جدید کے اہم شاعر جناب حافظ مظہر الدین مظہر کی کلیات کو خوبصورتی کے ساتھ شائع کیا ہے وہاں یہ مجموعہ بھی اس سلسلے کی ایک اور خوبصورت کڑی ہے۔ نعت مرکز سے بلاشبہ بہت اچھی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

نام کتاب: کچی منڈیر پر ایک چراغ/ترتیب کار: پروفیسر جنید اکرم/صفحات 304 / قیمت: 400 /تبصرہ نگار: نازاوکاڑوی

ناشر: بزم فقیر 125/3-B2، ٹاؤن شپ لاہور

ڈاکٹر فقیر محمد فقیر جنہیں مختلف القابات اور حوالہ جات سے پوری دنیا میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ اس انفرادیت کے ساتھ کہ انہوں نے اپنی مادری زبان ''پنجابی'' کے لیے نا صرف دن رات محنت کی بلکہ پنجابی زبان کی ترویج و ترقی کے لیے دن رات کوشاں بھی رہے۔ پنجابی ادب میں رائج ہر صنف پر طبع آزمائی کی۔ غزل، نظم، رباعی، حمد، نعت، نثر میں مضمون نگاری ہو یا ادارہ اُسے اوج کمال تک پہنچانے میں ڈاکٹر فقیر محمد فقیر کو کمال حاصل تھا۔ رباعی میں تو انہیں پنجاب کا عمر خیام بھی کہا گیا۔ 1965ء کی جنگ کے دوران میدان جنگ میں ان کے ملی ترانے فوجی بھائیوں کے دلوں کو گرماتے رہے۔ پروفیسر جنید اکرم نے '' کچی منڈیر پر ایک چراغ'' میں ڈاکٹر فقیر محمد فقیر کی علمی، ادبی کارناموں پر تحقیقی و تفصیلی تبصروں میں جمع کر کے پنجابی ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ شائقین پنجابی ادب کے لیے نایاب کتاب ثابت ہوگی۔ میں قارئین کو پڑھنے کی سفارش کرتا ہوں۔

نام کتب: کوئے گماں میں/ مصنف: خواجہ جنت تمنا/ صفحات 128 / قیمت: 350 روپے/ تبصرہ نگار: نازاوکاڑوی

ناشر: وجدان پبلی کیشنز، لاہور

دیارِ غیر میں بسنے والے خواجہ جنت تمنا کا شعری مجموعہ "کوئے گماں میں" اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چھپ کر مارکیٹ میں آ چکا ہے۔ اس شعری مجموعہ میں شاعر نے نا صرف قلبی واردات کو چھوٹے چھوٹے شعروں سے ہی چھوا ہے بلکہ اپنے اردگرد کے ماحول سے متاثر ہو کر وہ مشاہدات بھی اپنی شاعری میں نئے ڈھنگ کے ساتھ قارئین کے سامنے رکھے ہیں۔ کتاب کا ٹائٹل بھی جاذب نظر ہے۔ مجموعی طور پر یہ شعری مجموعہ ہر لحاظ سے ایک اچھے مجموعہ کی شرط پہ پورا اُترتا ہے۔ مجھے اُمید ہے قارئین کو بھی ضرور پسند آئے گا۔

نام کتاب: فسونِ چشم/ شاعر: صفدر حسن صفدر/ صفحات 248 / تبصرہ نگار: علی رضا

ناشر: نستعلیق مطبوعات، فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

جوہر آباد کی سرزمین ادبی حوالے سے بہت زرخیز ہے۔ وہاں بہت سی نابغۂ روزگار ہستیاں علم و ادب کی ترویج کے لیے کوشاں رہیں۔ جن میں کہنہ مشق اور استاد شاعر جوہر نظامی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انہوں نے نصف صدی سے زائد عرصہ تخلیق شعر و ادب میں بسر کیا اور بلاشبہ کئی نسلوں کی تربیت بھی کی۔ ان کے حلقہ احباب میں انور گوئندی، اخگر سرحدی، رشک ترابی، ڈاکٹر وزیر آغا، شہزاد احمد، شکیب جلالی، حبیب جالب، غلام جیلانی اصغر، قیصر بارہوی، محبوب خزاں اور دیگر ممتاز اہل قلم شامل رہے۔ انکے فرزندگان میں سے بھی حسن اختر جلیل، آفتاب حسین، مظفر حسن منصور اور فرخ راجا نے شعری تخلیق کے حوالے سے بہت نام کمایا۔ ان کے ایک اور صاحبزادے راجہ صفدر حسن جو صوبائی سول سروس پنجاب سے 1973 میں وابستہ ہوئے اور پنجاب بھر میں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد 2009ء میں ڈائریکٹر جنرل فیصل آباد ڈویلپمنٹ اتھارٹی کی حیثیت سے سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ حال ہی میں راجہ صفدر حسن کا اوّلین شعری مجموعہ "فسونِ چشم" کے نام سے بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ "نستعلیق مطبوعات اُردو بازار، لاہور" کی جانب سے شائع ہوا ہے۔ یہ کتاب 248 صفحات پر مشتمل ہے۔ جس کا فلیپ عطاء الحق قاسمی جبکہ دیباچہ معروف محقق اور نقاد ڈاکٹر ضیاء الحسن نے تحریر کیا۔ ان کے بقول "راجہ صفدر حسن صاحب نے اپنی تخلیق اور شعری بازیافت کا عمل تاخیر سے آغاز کیا ہے" 65 برس کی عمر میں شائع ہونے والے ان کے پہلے مجموعہ میں اُن جذبات و احساسات کا اظہار ہوا ہے جو 40 برس قبل ہونا چاہیے تھا۔" ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ وہ مستقبل میں ایک ہنرمند اور توانا تخلیق کار کے طور پر اپنی بھرپور شناخت بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ممتاز پبلشر حسن عباسی نے اس کتاب کو نہایت دلکش انداز میں شائع کیا ہے۔

نام کتاب: یادنامہ لالہ صحرائی/ شاعر: لالہ صحرائی/ صفحات 424 / تبصرہ نگار: علی رضا

پبلشرز: کتاب سرائے، لاہور

لالہ صحرائی کا تعلق تو جہانیاں سے تھا لیکن وہ اردو شعر و ادب کے منظرنامے پر پوری آب و تاب سے جلوہ گر رہے۔ وہ تمام عمر تخلیق سخن کے خوب صورت عمل سے گزرتے رہے۔ بہت کچھ لکھا۔ تقریباً تمام اصناف شعر و ادب میں طبع آزمائی کرتے رہے اور نظم و نثر کی تخلیق کے حوالے سے بہت سا کام کیا۔ انہوں نے بہت عرصہ نثر لکھی، افسانہ، ڈرامہ، رپورتاژ، طنز و مزاح، کالم نگاری اور مضامین و مقالات کے ذیل میں تقریباً نصف صدی تک بھرپور انداز میں مصروف سخن رہے۔ بہت سا تخلیقی کام کیا۔ بعد ازاں اچانک نعتیہ شاعری کی تخلیق میں منہمک ہو گئے۔ اُن کا اصل نام محمد صادق تھا لیکن اپنے قلمی نام لالہ صحرائی سے زیادہ معروف ہوئے۔ یہ ان کے عشقِ نبی کا اعجاز ہی تھا جس کی بدولت وہ کئی نعتیہ مجموعہ ہائے شاعری منظر عام پر لانے میں کامیاب ہوئے۔

زیرِ نظر کتاب یادنامہ لالہ صحرائی ان مضامین اور تحریروں پر مشتمل ہے جو اُن کے احباب اور دوستوں نے ان کی شخصیت اور تخلیقی کاموں کے حوالے سے لکھے۔ ان مضامین کو ممتاز ادبی اور عالمی شخصیت ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے ترتیب دے کر ایک اچھی کاوش کی ہے۔ یہ کتاب 424 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ڈاکٹر خورشید رضوی، حفیظ تائب،

عاصی کرنالی، شوذب کاظمی، حافظ محمد ادریس، مجیب الرحمان شامی، پروفیسر حسین سحر، سید منظور الکونین، ڈاکٹر حسین پراچہ، ناہید قاسمی اور دیگر بہت سے نامور اہل قلم کی تحریریں شامل ہیں۔ کتاب کا دیباچہ لالہ صحرائی کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید احمد صادق نے تحریر کیا ہے اور اس خوبصورت کتاب کو ''کتاب سرائے، لاہور'' نے شائع کیا ہے۔

نام کتاب: شیشہ ٹوٹ جائے گا/مصنف: مقبول الٰہی شیخ/صفحات 104 / قیمت: 150 روپے/رائے: پروفیسر فتح محمد ملک

ناشر: زرناب پبلی کیشنز، فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

جناب مقصود الٰہی شیخ وطن کو چھوڑ کر نہیں، بلکہ وطن کو اپنے ساتھ لے کر انگلستان گئے تھے۔ ہر چند ایک عرصہ دراز سے بریڈفورڈ میں مقیم ہیں تاہم پاکستان کے دل میں بستا ہے۔ سات سمندر پار زندگی بسر کرتے ہوئے بھی وہ پاکستانی تہذیب و معاشرت کو سرسبز و شاداب رکھنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ پاکستانی تہذیب و معاشرت کے بنیادی اصول واقدار کو زندہ و عام کرنے میں انہوں نے اپنے فنی اعجاز اور اپنی تنظیمی صلاحیت، ہر دو سے بیش از بیش کام لیا ہے۔ جہاں تک فنی اعجاز اور تخلیقی ثروت مندی کا تعلق ہے اس کے ثبوت ان کی فکشن اس تہذیبی آشوب کی دردمندانہ عکاسی کا فریضہ سرانجام دیتے وقت پیش کرتی چلی آ رہی ہے۔ آج کی اردو دنیا جس کی گرفت میں ہے۔ جہاں تک تنظیمی جوش عمل کا تعلق ہے مجلہ ''راوی'' گزشتہ ربع صدی سے جہانِ اُردو کے آفاق کو وسیع سے وسیع تر کرتا چلا آ رہا ہے۔ مقصود الٰہی شیخ صاحب کے جذبہ جنون کی بدولت بریڈفورڈ بھی اُردو دنیا کا تہذیب مرکز بن چکا ہے۔

نام کتاب: خیال خام (مجموعہ شاعر)/شاعر: انجم خیالی مرحوم/قیمت: 250 روپے/فلیپ نگار: منصور آفاق

ناشر: ادبی تنظیم مجلس اوراق 1-B،E-2 گلبرگ 3 لاہور

یہ کوئی شاعری کا مجموعہ نہیں، ایک لٹے پٹے درویش کی بچی کھچی متاع ہے۔ ایک برباد شدہ قصر فریدوں کا باقی ماندہ خزانہ ہے۔ بیدردی سے کاٹی ہوئی فصل گل کے بعد کھیت میں رہ جانے والے موتیوں بھرے خوشوں کی ڈھیری ہے۔ اس کتاب میں اُس سبزہ زار کے بچے کھچے پھول ہیں جسے برسوں تک روندا گیا۔ پھولوں والے درویش کو دنیا سے گئے کئی برس ہو چکے ہیں اور اس کی کتاب دل کے اجزا مختلف لوگوں کے پاس ہیں۔ کس کس سے مانگنے جائیں۔ روشنی اور خوشبو کی اس بڑی ''لوٹ'' کے متعلق درویش کا خیال مجھ سے مختلف تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ میں تو میٹھے پانیوں کا سمندر تھا اب بھی ہوں۔ سب نے بقدر ظرف پیا۔ میرا کیا گیا مگر میں سمجھتا ہوں اگر برسوں تک کسی سمندر کے سیپیوں سے موتی چرائے جاتے رہیں تو ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری شعاعوں میں غوطہ خوروں کی تلاش فیروز مندیوں سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ میں اس مجموعہ کی اشاعت پر انجم خیالی کے بیٹے جمیل انجم کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ تلاش کلام میں ان کے تعاون سے انجم خیالی کے کئی اور مجموعے بھی جلد منظر عام پر آئیں گے۔

نام کتاب: ہوا چہ گرائے گی (شعری مجموعہ)/شاعر: گلزار بخاری/قیمت: 300 روپے/فلیپ نگار: نجیب احمد

ناشر: امیر پبلی کیشنز 18/4 بدر کالونی، ہربنس پورہ، لاہور

ہوا سے مکالمہ کرتی شاعری کو اعتبار کی خوشبو سے ہم کنار کرنے والا گلزار بخاری ایک قادر الکلام شاعر ہے جو شعر گوئی کے تمام تر اسرار و رموز سے بخوبی آشنا

ہے۔مصرعہ مصرعہ ہلکورے لیتی درد کی لہر دلوں کو چھو کر گزرتی ہے تو آنکھ میں در آنے والی خوش رنگ نمی کی جھیل روح کی وادیوں میں سر اُٹھانے لگتی ہے۔سچائی کے نور سے روشن دو مصرعوں میں سانس لینے والی بات قاری کو اپنے غم کا عکس دکھائی دیتی ہے۔وہ اس لیے کہ دورِ حاضر کے مسائل اور زندگی کے چہرے پر لگے زخموں کی گنتی گلزار بخاری کی پوروں پر نہیں ٹھہرتی، سطروں میں ڈھلتی چلی جاتی ہے۔اسی باعث اس کا کلام پڑھنے والے کو اپنے جمال کی سحر آثار گرفت میں تا دیر لیے رکھتا ہے۔حرف کی حرمت کو فن کی اساس سمجھنے والا یہ شخص روایت کے ساتھ اپنا رشتہ قائم رکھے ہوئے جدید تر احساس کی روش سے خیر وحسن کے پھول چن رہا ہے۔میری دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے ہاتھوں کو کانٹوں کی چبھن سے محفوظ رکھے۔آمین!

نام کتاب: درس دھارا (شعری مجموعہ)/شاعر: شاہین عباس/قیمت: 350 روپے/فلیپ نگار: شناور اسحاق

ناشر: کاغذی پیرہن، عظیم مینشن، رائل پارک لاہور، 0321-4649684

بہت یاد آئی۔''زوال'' کا مرکزی کردار تو یہاں تک کہتا ہے کہ آنے والا مورخ ہمارے بارے میں صرف ایک جملہ لکھے گا اور وہ یہ کہ ''اس عہد کا انسان اخبار پڑھتا تھا اور گناہ کرتا تھا''......تو اس ایک جملے نے بیسویں صدی کے وسط کے یورپ کو بالعموم اور فرانس کو بالخصوص چوراہے میں پٹخ دیا تھا۔''درس دھارا'' کی نظمیں بھی ایک نوع کے عالم آشوب کا حکم رکھتی ہیں۔اخلاقی اور سیاسی زوال پر غضب آمیز ماتم! گویا شاہین عباس بھی عہدِ حاضر کے اس سوادِ اعظم سے منسلک ہے جو جغرافیے پر تاریخ کے تسلط کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔اُس نے ان نظموں میں ایک نئی زبان وضع کی ہے۔وہ اپنے اندر موجود غزل گو سے پہلو تہی کرتے ہوئے ایک نئے آہنگ سے گویا ہوا ہے۔ایسی نظمیں کسی منصوبہ بندی کے تحت تکمیل پذیر نہیں ہوتیں۔یہ تخلیقی وفور کی بارش میں اپنے خالق کا بازو پکڑے اُسے جہاں چاہیں لے جاتی ہیں اور شاعر، بازو چھڑانے کی کوشش نہیں کرتا۔وہ نیم وا آنکھوں سے شعور اور لاشعور کے مابین جھولتا دکھائی دیتا ہے۔شاہین عباس کے ہاں علامتوں اور استعاروں کا ایک منفرد نظام متشکل ہوا ہے جو انوکھا بھی ہے اور مشکل بھی۔ان نظموں پر کہیں کہیں شاعری کی مانوس جمالیات سے انحراف کا الزام بھی لگ سکتا ہے۔آپ انہیں قبول کرتے ہیں یا نہیں۔ ہر دو صورتوں میں آپ پر تفہیم کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔اگر آپ یہ ذمے داری قبول کرتے ہیں تو ''درس دھارا'' کی نظمیں ضرور پڑھیے!!

نام کتاب: عشق جینے کا اک سلیقہ ہے (شعری مجموعہ)/شاعرہ: فرحت زاہد/قیمت: 250 روپے/فلیپ نگار: عطاء الحق قاسمی

ناشر: سانجھ پبلی کیشنز، بک اسٹریٹ فرنگ، روڈ، لاہور 042-755323

فرحت زاہد کی شاعری کا میں گزشتہ تین دہائیوں سے قاری اور سامع ہوں۔جب وہ امریکہ میں تھی تب بھی اُس سے مشاعروں میں ملاقات ہو جاتی تھی اور اب جبکہ وہ مستقل طور پر پاکستان آ گئی ہے تو اس کی تازہ شاعری سننے کے مواقع زیادہ میسر آتے ہیں۔فرحت زاہد کے اندر ایک مکمل شاعرہ ہے۔نظم ہو یا غزل وہ دونوں اصناف پر کمال دسترس رکھتی ہے۔تازہ اور شگفتہ ہونے کے باوجود اُس میں کچا پن بالکل نہیں ہوتا جو کہ عموماً شاعرات کے ہاں رہ جاتا ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسے شعر کہنے کی جلدی نہیں ہوتی وہ پیڑ کی شاخ کی طرح موسم بدلنے اور نئے پھل پھول آنے کا انتظار کرتی ہے۔جب تک اُس کی تخلیق خوشبو اور رس سے بھر نہیں جاتی وہ اُسے سپردِ قارئین نہیں کرتی۔یہی وجہ ہے کہ اُس کی ساری شاعری منتخب ہے جسے ایک سے زیادہ بار پڑھا جا سکتا ہے۔بلاشبہ فرحت زاہد کا شعری مجموعہ ''عشق جینے کا اک سلیقہ ہے'' اچھے شعری مجموعوں میں نہایت خوشگوار اضافہ ہے۔میری دعائیں اور نیک تمنائیں فرحت کے ساتھ ہیں۔اللہ اُسے اور عزت دے۔

نام کتاب: نہیں/افسانہ نویس: انیلہ بھٹو/ قیمت: 300 روپے/فلیپ نگار: حسن عباسی

ناشر: نستعلیق مطبوعات، فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37351963

انیلہ بھٹو کی کتاب ''نہیں'' کا نام اپنے اندر بہت سے معانی و مفاہیم لیے ہوئے ہے۔ اس کے بہت سے شیڈز اور بہت سی پرتیں ہیں۔ ''نہیں'' مکمل انکار بھی ہے اور اثبات کے سبھی چشمے بھی اسی سے پھوٹتے ہیں۔ معاشرے میں ہونے والے ظلم اور ناانصافی کو دیکھ کر اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ انسانوں کے رویے ایسے سفاکانہ بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے جب کوئی سانحہ اُس کے سامنے رونما ہوتا ہے بے ساختہ اس کی زبان سے نکلنے والا نہیں کا لفظ اُس کی زندگی کے مسودے میں ایک اور افسانے کا اضافہ کر جاتا ہے۔ انیلہ کے افسانے پڑھکر اندازہ ہوتا ہے کہ کم عمری کے باوجود اُس کی زندگی سے متعلق مشاہدہ اور تجربہ بہت وسیع ہے۔ یوں تو زندگی سے انسان روز ہی کچھ نہ کچھ سیکھتا ہے لیکن کچھ لوگوں کو زندگی وقت سے پہلے بہت کچھ سکھا دیتی ہے۔ انیلہ کے افسانوں کا تانا بانا بھی زندگی کے اسی رویے کا مرہونِ منت لگتا ہے۔ انیلہ نے سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے اپنے افسانوں میں جنسیت کا تڑکہ نہیں لگایا بلکہ اس سے بالاتر ہو کر اُن موضوعات پر قلم اُٹھایا جو قاری کو ایک فکر اور سوچ عطا کرتے ہیں۔ وہ فکر اور سوچ جس سے معاشرے میں مثبت تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ تبدیلی کے اس جہاد میں انیلہ نے دردِ دل اور مکمل خلوص کے ساتھ اپنا حصہ ڈالا ہے۔ اس کی تحریر میں سچ کی طاقت ہے اور سچ ایک نہ ایک دن اپنا آپ منوا کر رہتا ہے۔ اُمید ہے بہت جلد انیلہ کے تحریروں کا اعتراف کیا جائے گا۔

نام کتاب: غالب کی آپ بیتی/ مصنف: پروفیسر نثار احمد فاروقی/ قیمت: 200 روپے/تبصرہ نگار: سید مظفر حسن بزمی

ناشر: بک ہوم، بک سٹریٹ، 46 مزنگ روڈ، لاہور 0423-7231518

سب سے پہلے غالبؔ کے سوانح حیات مولانا الطاف حسین حالی نے ''یادگارِ غالبؔ'' کے نام سے لکھی تھی۔ اس کے بعد مختلف ادبا و ناقدین نے اس موضوع پر لکھا۔ جن میں غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرم اور مالک رام ممتاز ہیں۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی صاحب نے غالبؔ کی زیرِ نظر سوانح حیات ایک نئے اور اچھوتے انداز بیان میں لکھی ہے۔ اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ خود غالبؔ کا ہے۔ اسے بجا طور پر ''غالبؔ کی کہانی خود اُن کی زبانی'' کہنا مناسب ہوگا۔ مرزا غالبؔ نہ صرف اُردو کے عظیم ترین شاعر تھے بلکہ اُردو نثر پر بھی انہوں نے اپنا گہرا اور انمٹ نقش چھوڑا ہے۔ غالبؔ کی نثر کا سارا حسن اس کی سادگی، سلاست اور روانی ہے۔ وہ عام بول چال اور روزمرہ کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑی سے بڑی بات کہہ جاتے ہیں۔ بات میں بات پیدا کرتے ہیں۔ اپنے خطوط کے بارے میں ان کا یہ کہنا درست ہے کہ انہوں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔

مرا غالبؔ کی فطرت میں شوخی اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی جو اُن کے اسلوب بیان میں جابجا جھلکتی ہے۔ وہ بات بات میں ہنسنے ہنسانے کا موقع نکال لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا انداز بیان نہایت شگفتہ، دلچسپ اور پرلطف ہے۔ کتاب زیرِ نظر کی جاذبیت خاص طور پر غالبؔ کے انداز بیان میں مضمر ہے۔

پیش خدمت کتاب کے مرتب و مؤلف ڈاکٹر نثار احمد فاروقی صاحب ہمارے عہد میں برصغیر ہند و پاک کے اردو ادب کی صف اول میں ایک ممتاز اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وہ بیک وقت ادیب، ناقد، محقق اور دانشور ہیں۔ عربی زبان و ادب کے نامور اسکالر ہیں۔ اب تک میر تقی میر پر جتنی لائق قدر کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ڈاکٹر صاحب موصوف کی وقیع اور قابل تحسین تصنیف ''میر کی آپ بیتی'' ہے۔ اس کے علاوہ ان کی متعدد کتابیں چھپ چکی ہیں۔

نام کتاب: اسی دشت میں (شعری مجموعہ) / شاعر: اظہر عباس / قیمت: 250 روپے / تبصرہ نگار: نعیم گیلانی

ناشر: انحراف پبلی کیشنز، لاہور

عہدِ نو کی غزل ولی دکنی، میر، غالب، ذوق، اقبال، فیض، ناصر کاظمی اور فراز سے ہوتی ہوئی ایک طویل اور کٹھن سفر کے بعد اظہر عباس تک پہنچی ہے۔ اظہر عباس کے ہاں بہت سے پیشرو شعراء کے نشان ملتے ہیں لیکن یہ اظہر کی قوت استفادہ اور اکتساب فیض کا تذکرہ ہے۔ اظہر عباس نے اپنے پیش رو شعراء سے فیض ضرور حاصل کیا ہے۔ مگر اپنے شعری کینوس پر کسی کے رنگ سخن سے تصویر کشی کرنے کی قطعی کوشش نہیں کی۔ بلکہ اپنا اسلوب بہر صورت قائم و دائم رکھا ہے۔ اظہر عباس نے پامال زمینوں، روندے ہوئے قافیوں اور باسی لفظیات کے استعمال سے حتی المقدور پرہیز ہی برتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اظہر عباس کے کلام میں سلیقے اور ہنرمندی سے کہے ہوئے اشعار جابجا ملتے ہیں جو اس تازہ کار شاعر کے منفرد اسلوب کی گواہی دیتے ہیں۔

میں یہ بات پورے تیقن کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ بھی میری طرح اظہر عباس کے شعری جمالیات سے از حد لطف اندوز ہوں گے۔ مجھے یہ بھی اُمید ہے کہ ادبی حلقوں میں اظہر عباس کے تازہ شعری مجموعے ''اسی دشت میں'' کا استقبال کھلے ذہنوں، کھلے دلوں اور کھلی بانہوں سے کیا جائے گا۔

نام کتاب: کچھ محبت پہ بات ہو جائے (شعری مجموعہ) / شاعرہ: فاخرہ انجم / قیمت: 500 روپے / تبصرہ نگار: امجد اسلام امجد

ناشر: ماورا بکس، 60 دی مال روڈ، لاہور 042-36303390

ادا جعفری سے پروین شاکر تک اقلیم سخن میں شاعرات کی تعداد نسبتاً محدود رہی ہے مگر گزشتہ بیس برس میں یوں لگتا ہے جیسے یہ پیچھے رہ جانے والے ٹرک ڈرائیوروں کی طرح لیٹس (Lates) نکال رہی ہیں۔ ہجوم زیادہ ہو تو اس میں چہرہ گم ہو جانے کا خطرہ بھی بڑھ جاتا ہے۔ فاخرہ انجم کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اُس نے اپنی موجودگی کا نہ صرف احساس دلایا ہے۔ بلکہ اپنی پہچان بنانے کی بھی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اگر وہ اس طرح کے اشعار مسلسل کہنے میں کامیاب رہی تو اُس کی پہچان کا عمل بھی آسان ہو جائے گا۔

نام کتاب: میں کہنا چاہتی ہوں (شعری مجموعہ) / شاعرہ: بشریٰ سعید / قیمت: 200 روپے / تبصرہ نگار: مقصود وفا

ماضی کی دھند میں گونجتا ہوا بشریٰ کا لہجہ اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ شاعری اس کی ذات کا ایک ایسا لازمی جز ہے جس کے بغیر وہ مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ موجودہ عہد کی شاعری کے مرکزی دھارے سے دور اپنی تنہائی سے مکالمہ کرتی ہوئی بشریٰ سعید کا یہ اظہار یہ نام و نمود کے لیے نہیں ہے۔ یہ شاعرانہ خود کلامی خاموشی کے اس خول کو توڑنے کے لیے ہے جس کی قید میں اس کے لفظ دم توڑ رہے تھے۔ لفظوں کو اپنے جذبے کے معنی عطا کرنے کی یہ کوشش اتنی مخلصانہ اور دردمندانہ ہے کہ بالآخر لفظوں نے بشریٰ کو اپنا آپ سونپ دیا ہے اور الفاظ یہ مہربانی صرف اور صرف اس کے ساتھ روا رکھتے ہیں جس نے ایک لمبی چپ کی اذیت کو سہا ہو۔ بشریٰ کی یہ نثری نظمیں اس کا بے ساختہ اظہار ہیں جو اس کی پہلی کوشش تو ہو سکتی ہے لیکن آخری ہرگز نہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے خیال و خواب کے ملبے میں دبی خاموشیاں سر اُٹھا کر اسے آواز دیتی رہیں گی۔ کیونکہ بشریٰ کی خاموشیاں یہ جانتی ہیں کہ اُن کی آواز کو لفظوں میں ڈھالنے کا فن بشریٰ سعید کو آتا ہے۔

نام کتاب: تنقید سے فرصت نہیں (ادبی کالم) / مصنف: جمیل احمد عدیل / قیمت: 300 روپے / فلیپ نگار: ڈاکٹر خالد ندیم

ناشر: الفتح پبلی کیشنز

جمیل احمد عدیلؔ کو میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتا ہوں اور اس کی اسی حیثیت پر اصرار کرتا ہوں لیکن وہ ہے کہ علم و ادب کی ہر صنف کو زیر کرنا چاہتا ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ وہ جس صنف کو چھو لیتا ہے نئے رنگوں اور نئے ذائقوں سے آشنا کر دیتا ہے۔ عہد حاضر کی تحریر و تقریر جوش جذبات اور آہنگ کی بلندی سے تو مملو ہے، لیکن دیگر فنی خصوصیات کو بالعموم پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ ایسے میں عدیلؔ کی تنقیدی تحریریں اپنی خوب صورت اور تازہ نثر کی وجہ سے اس شعبہ ادب میں تازہ ہوا کا ایک جھونکا محسوس ہوتی ہیں۔ سیاست اور حالات حاضرہ پر فوری تبصرہ اخبار کی ضرورت ہے اور اخبار کا قاری کسی واقعے یا حادثے کے فوری اثرات کی گرفت میں رہتا ہے لیکن عدیلؔ بھی اپنی سرشت سے مجبور تھا۔ چنانچہ سیاست کے خارزار میں بھی اس کی انشا پردازی نے ادبی قاری کی ضیافت کا سامان کیے رکھا۔ پھر جلد ہی اس نے بعض ادبی موضوعات و شخصیات پر باقاعدہ لکھنا شروع کر دیا تو اس کی کالم نگاری میں تخلیقیت کا پہلو بھی نمایاں طور پر نظر آنے لگا۔ عدیلؔ کے ادبی کالم حقیقتاً ادبی مضامین ہیں۔ اگر انہیں کم سے کم نمبر بھی دیے جائیں تو تاثراتی تنقید کہہ سکتے ہیں لیکن صاحبو! تاثراتی تنقید میں نیاز فتح پوری اور عبدالرحمٰن بجنوری کی روایت سے تعلق رکھتے ہوئے بھی اس نے اپنے لیے نئی دنیا تلاش کر لی ہے جہاں اس کے اپنے اسلوب کی حکمرانی ہے اور طرز ادا میں کوئی دوسرا ادیب اس کا شریک نہیں۔ جمیل احمد عدیلؔ کی تحریروں کو افسانہ کہا جائے یا ناولٹ، سفرنامے کا نام دیا جائے یا مضمون نویسی کا، انہیں انشائیہ قرار دیا جائے یا خاکہ وہ تنقید ہو یا اخباری کالم، اپنی انشا پردازی کی وجہ سے عدیلؔ کی منفرد شخصیت ان سب کو ایک لڑی میں پرو دیتی ہے اور یہی وہ میدان ہے جس میں عدیلؔ کے معاصرین اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے۔ اگرچہ عدیلؔ نے ان تحریروں کو 'ادبی کالم' کہہ کر اپنی ذمہ داری کم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کے مطالعے کے بعد قاری پر منکشف ہوگا کہ یہ کالم تجزیاتی مضامین ہیں جو اپنے مصنف کے جملہ خصائص کا برملا اظہار ہیں۔

نام کتاب: جدید اُردو نظم نظری و عمل / مصنف: عقیل احمد صدیقی / قیمت: 690 روپے / تبصرہ نگار: شہریار

ناشر: بیکن بکس، فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور

اکیڈمیوں کی مالی اعانت کی وجہ سے اُردو میں کتابیں بہ کثرت شائع ہونے لگی ہیں۔ ان میں شاعری، افسانے، ناول کے علاوہ تنقید کی کتابیں بھی ہوتی ہیں۔ شاعری اور افسانوی ادب کی کتابوں کی اشاعت سے اگر کوئی فائدہ نہیں ہوتا تو نقصان بھی نہیں ہوتا لیکن تنقید کی کتابوں سے یقیناً نقصان پہنچ رہا ہے۔ ادب کے بارے میں عام طور سے اور جدید ادب کے بارے میں خاص طور سے بہت سی غلط فہمیاں اور گمراہیاں انہیں ناقص کتابوں کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ وجہ صاف ہے، ادب کا مطالعہ جس علم اور شعور کا مطالبہ کرتا ہے اکثر ناقدین اس سے نابلد ہیں۔ عقیل احمد کی کتاب کی اشاعت کے وقت اس صورت حال کی گمبھیرتا کا اور بھی احساس ہوا۔ اس کتاب میں پہلی بار غیر جانب داری اور علمی انداز میں جدید نظم کے عہد بہ عہد ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان تمام عناصر اور عوامل کی نشاندہی کی گئی ہے جن سے گزر کر نظم کی صنف نے وہ شکل اختیار کی ہے جس کو ہم جدید کہتے ہیں۔ جدید نظم نہ تو کسی خاص ہیئت، اسلوب یا موضوع کا نام ہے اور نہ یہ کسی خاص زمانے یا گروہ سے مخصوص ہے۔ بلکہ اس کے کئی ابعاد اور گوشے ہیں اور یہ سب یکساں اہمیت اور توجہ کے حامل ہیں۔ عقیل احمد نے اپنی کتاب میں اس بات کو جس علمی اور مدلل انداز میں پیش کیا ہے اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ایک تحقیقی مقالے کی سطح اور معیار کیا ہونا چاہیے عقیل احمد کا یہ مقالہ اس کی ایک مثال ہے۔ اچھی اور معیاری کتابوں کی قدر کرنے والوں کا ایک طبقہ آج بھی موجود ہے اس لیے مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کی قدر ہوگی۔

نام کتاب: فکشن کا اسلوب / مصنف: خالد محمود خان / قیمت: 240 روپے / تبصرہ نگار: ڈاکٹر محمد ساجد خان

ناشر: بیکن بکس، فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

خالد محمود خان مجھے ہمیشہ محو سفر مسافروں کی طرح نظر آتے ہیں۔ ان کا یہ سفر ذاتی زندگی کے علاوہ طویل علمی منازل کی تلاش ہے۔ وہ فن ترجمہ نگاری پر کافی کچھ کام کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ ان کی سوچ اور پیش کاری کا اسلوب خالصتاً علمی Scientific ہوتا جا رہا ہے۔ ادبی رویوں میں یہ تبدیلی بہت ہی مستحسن قدر ہے اور نئے رجحانات اور ادبی معیارات کا پیشگی اعلان کرتی نظر آتی ہے۔ میرے لیے اُن کی تحریروں کا تعارف کسی بھی اعزاز سے زیادہ محترم ہے۔ مجھے اُن کی دوستی کا شرف بھی حاصل ہے اور محبت کا اعتبار بھی۔ وہ حکومت پاکستان کے محکمہ ایف بی آر میں ملازمت کرتے ہیں۔ اپنے فرائض بہت ہی تندہی سے سرانجام دینے کو فرض کا قرض یقین کرتے ہیں۔ اُن کی اقدار میں اپنا خاندان توجہ کی اولین اور مرکزی اکائی ہے۔ اُن کے خیال میں جس نے یہ فرض بطریق احسن سرانجام نہ دیا اُس کے کوئی نفل مستجاب نہ ہوئے۔ میرا اُن سے عمر بھر کا ساتھی ہے۔ اس کے باوجود ترجمہ، تخلیق اور تحقیق کے میدان میں ان کا کام میری آنکھوں میں بے شمار حیرانیاں سجا دیتا ہے۔

نام کتاب: پاکستان میں غالب شناسی / مصنف: ڈاکٹر شکیل پتافی / قیمت: 1250 روپے / تبصرہ نگار: آغا تنویر

ناشر: بیکن بکس، فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور

کتاب کا آخری باب ''پاکستان میں غالب شناسی کا مستقبل'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں غالب پر لکھنے کی ضرورت کو واضح کرتے ہوئے اُردو زبان و ادب پر غالب کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے اور گزشتہ تمام ابواب کے مباحث کو سمیٹتے ہوئے غالب شناسی کی روایت کو مضبوط تر بنانے کے لیے کچھ تجاویز دینے کے ساتھ ساتھ مستقبل میں غالب شناسی کے امکانات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیر ادارت شائع ہونے والا مجلہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ چودہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے

اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے جنوری 2015 کا سالنامہ حاصل کریں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

نامہ ہائے احباب

واجب الاحترام عامر بن علی/حسن عباسی صاحب
''ارژنگ نقش''

دعائے سلامتی۔ ارژنگ اسی ''سلامت روی'' سے ملا۔ اس کی لطافتیں اور لذتیں وہی دیکھی بھالی ہیں۔ شعراء کے گوشے نئی آب و تاب کے ساتھ ارژنگ نما کرنے کا فیصلہ خوش آئند ہے۔ اس ضمن میں میرا لفافہ تیار ہے بھیجتا ہوں۔ آپ جانیں میں یہاں اس گوشے میں ایک رُکن ایک اکیلا ہوں۔ احباب سے دور ہوں۔ ورنہ احباب کا کلام بھی بھیجتا۔ ایبٹ آباد والوں سے آپ کا رابطہ بدستور ہے۔ وہ رسالے میں متعلقہ اعلان پڑھ چکے ہوں گے۔ اب کے بھی گوشہ شاعری خوب ہے۔ متفرق شاعری حسب سابق ہے۔ پنجاب رنگ میں یہ شعر دیکھئے

تکی- عمرے چلے پے گئے
دکھ میرے تے میں کلی

گلفام نقوی

مزاح میں پھکڑ پن نہ ہو تو مزاح کام کی چیز ہے۔ ارژنگ کا کریڈٹ ہے کہ اس میں طنز و مزاح میں دُکھ لیرے' والی بات نہیں۔ آپ کے پاس نام اور لکھنے والے موجود ہیں۔ جو نواں انداز تحریر رکھتے ہیں۔

خیر اندیش

آصف ثاقب

جناب محترم عامر بن علی/حسن عباسی صاحب

السلام علیکم۔ ''ارژنگ'' مل گیا تھا۔ پہلے کی طرح خوبصورت گٹ اپ اور عمدہ علمی اور ادبی کاوشوں کے ساتھ شکریہ البتہ تحریروں کی پروف ریڈنگ آپ کی توجہ چاہتی ہے۔ ایک غزل برائے ''ارژنگ'' ارسال خدمت ہے۔ خدا کرے آپ مع اہل خیریت سے ہوں۔ آمین

احقر

نصرت صدیقی

محترم عامر بن علی/حسن عباسی صاحب

السلام علیکم۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ ''ارژنگ'' باقاعدگی سے مل رہا ہے جس کے لیے سراپا سپاس گزار ہوں۔ حسب وعدہ اس کے لیے کچھ نعتیں اور دو تین حمدیں بھیج رہا ہوں تاکہ ایک صفحے کا ''گوشہ حمد و نعت'' ترتیب پا جائے۔ انتخاب خود کر لیجیے گا۔ ''ارژنگ'' کے بھی ارکان کو سلام۔

خیر اندیش

محمد ممتاز راشد

لاہور

عامر بن علی/حسن عباسی صاحبان

السلام علیکم۔ ''ارژنگ'' لحہ بہ لحہ دم بہ دم خوبصورت، کارآفریں اور دل کشا جریدۂ ادب بنتا جارہا ہے۔ تمام ادبی حلقوں میں اس کی اشاعت کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ جونہی پرچہ ہاتھ آتا ہے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ البتہ یہ خواہش بروئے کار آ جائے کہ آپ حرفِ اوّل کے طور پر بطور تمہید کسی ادبی موضوع پر اپنے مدیرانہ تاثرات کو ضرور قلم بند فرمایئے کہ آپ ادب کے عصری رویوں میں کسی خامی کی نشاندہی کریں یا اُسے نتیجہ خیز اور موثر بنانے کی تجاویز تحریر فرمائیں۔ آپ اس امر کی وضاحت پر قادر ہیں۔ لہٰذا اس تشنگی کو (بزبانِ انحصار ہی سہی) دور فرمانے کا فکر کیجیے۔

سیّد ریاض حسین زیدی

ساہیوال

جناب عامر بن علی/حسن عباسی صاحبان

سلام مسنون! اُمید ہے آپ بفضل تعالیٰ بخیریت ہوں گے۔ ماہنامہ ''ارژنگ'' کا شمارہ نمبر 8 (ستمبر، اکتوبر 2014ء) موصول ہوا۔

آپ جس توجہ اور باقاعدگی سے یہ میگزین مجھے روانہ کرتے ہیں اس کے لیے میں تہہ دل سے آپ کا ممنون ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آپ کی ادارت میں اس میگزین کی اشاعت ایک ایسا خوشگوار اور مسرت انگیز علمی و صحافتی واقعہ ہے جس کا اعتراف از حد ضروری ہے۔ اُردو زبان کے فروغ اور ادب کی ترویج کے حوالے سے بھی آپ کی کوششیں قابل قدر ہیں۔

میری دعا ہے کہ رب العزت آپ کو اور آپ کے ادارہ کو کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار کرے۔

والسلام

سحر صدیقی

جناب عامر بن علی/حسن عباسی صاحبان

آداب! ارژنگ مل گیا بے حد شکریہ۔ بس ایک ہی شکایت رہی کہ ایڈریس غلط تھا۔ بہرحال رسالہ پہنچ گیا۔ کچھ تحریریں رسالے کے لیے پیش خدمت ہیں۔ بہت شاندار ادبی رسالہ ہے۔ تمام تحریریں بہت پسند آئیں۔ خاص طور پر پروین شاکر کے گھاؤ والا مضمون شاعری، افسانے سب آپ کی بہترین کاوش ہیں۔ بہت سی دعاؤں کے ساتھ۔

آسناتھ کنول

محترم برادرم جناب حسن عباسی صاحب!

سلام خلوص! آپ نے ارژنگ کے گزشتہ شمارے میں میرا خصوصی گوشہ شائع کر کے پھر اس کی کچھ

کا بیان ارسال کر کے دوہرا احسان کیا ہے۔ ابھی اس کے شکریے کا قرض مجھ پر باقی تھا کہ اگلا شمارہ موصول ہو گیا۔ بہرحال! آپ ارژنگ کے ذریعے بڑے مراکز کے ساتھ ساتھ مضافاتی ادب کو بھی منظر عام پر لانے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ بلکہ آج کل تو سوشل میڈیا کے توسط سے مرکزی اور مضافاتی ادب کی تفریقی اصطلاحات اپنے معنی کھو رہی ہے اور واضح ہو رہا ہے کہ کون، کہاں اور کیا تخلیق کر رہا ہے۔ اسی سلسلے میں ارژنگ جیسے رسائل بھی اپنا بھرپور حصہ ڈال رہے ہیں۔

ارژنگ کو دیگر ادبی رسائل پر خاص طور پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ اس نے نہ صرف معیار کو بدستور قائم رکھا ہے بلکہ اشاعت کے تسلسل کو بھی برقرار رکھا ہے جو آج کل کے مادی دور میں ایک معجزے سے کم نہیں۔ میرے خیال میں اس کارِ خیر میں آپ کی پوری ٹیم بالخصوص عامر بن علی جیسے مستعد، متحرک اور باصلاحیت لوگوں کی کاوشیں شامل ہیں۔ ارژنگ میں خصوصی گوشوں، متفرق شاعری، افسانوں اور مضامین کے بہترین انتخاب کے علاوہ ادبی تقریبات کی رپورتاژ اور کتابوں پر جامع تبصرے بھی رسالے کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کی یہ تجویز کہ ''آئندہ تخلیق کاروں کے نام کے ساتھ ان کا فون نمبر اور پتہ بھی لکھا جائے گا'' خوش آئند ہے۔ اس سے ملک بھر اور بیرون ممالک کے تخلیق کاروں کے براہ راست باہمی رابطے قائم ہو سکیں گے۔ محرم الحرام کے حوالے سے میں اپنی تازہ منقبت آئندہ شمارے کے لیے ارسال کر رہا ہوں۔ مناسب ہو تو اسے شاملِ اشاعت کر دیجیے گا۔ شکریہ

دُعاگو

ہدایت کاشف/رحیم یار خاں

جناب عامر بن علی/حسن عباسی صاحبان!

صد آداب! آپ کا ماہنامہ ادبی جریدہ ''ارژنگ'' پچھلے دنوں ایک دوست کی معرفت مطالعہ کے لیے ملا۔ میں آپ کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔ میں پنجابی ادب کا لکھاری ہوں۔ کچھ پنجابی کلام ارسال کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ قریبی اشاعت میں جگہ دیں گے۔ اُمید واثق ہوں کہ ارژنگ کے قارئین انہیں پسند فرمائیں گے اور میری حوصلہ افزائی کریں گے۔

آپ کا مخلص

جبار ظفر

میرے اپنے بھائی حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ ارژنگ باقاعدگی سے مل رہا ہے اور ہماری زندگیوں میں حسن و دانش اور شائستگی بھرتا جا رہا ہے۔ ادب کی اس کساد بازاری میں اتنی باقاعدگی کے ساتھ اس قدر خوب صورت اور خوب سیرت جریدہ اتنے اہتمام کے ساتھ شائع کرنا فقط آپ ہی کا کام ہے۔ اللہ پاک آپ کو اسے جاری و ساری رکھنے کی توفیق ارزانی فرمائیں۔ آمین

آپ کو چاہنے والا

دستگیر شہزاد

ٹوبہ ٹیک سنگھ

برادرم حسن عباسی صاحب!

سلام و خلوص! عید پر عامر بن علی آئے تو ان کے اعزاز میں احباب نے بھرپور شعری نشست کا اہتمام کیا۔ رپورٹ دیر سے ارسال کر رہا ہوں اُمید ہے آپ شائع کر دیں گے۔ چند غزلیں ہیں انتہائی تازہ بھی ارسال کر رہا ہوں۔ ارژنگ میں شامل کر لیجیے گا۔

والسلام

مظہر بخاری

میاں چنوں

برادرم محترم حسن عباسی!

السلام علیکم۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ ارژنگ نظر نواز ہوتا رہتا ہے اور اس کا مطالعہ دل و نگاہ کو چاشنی عطا کرتا ہے۔ تمام تحریروں کا انتخاب لاجواب ہوتا ہے جو آپ کے حسنِ نظر کا آئینہ دار ہے۔

ارژنگ کے آئندہ شمارے کے لیے اپنی غیر مطبوعہ دو غزلیں ارسال کر رہا ہوں۔ اگر معیار پر پوری اُتریں تو شائع فرما کر شکریہ کا موقع دیجیے گا۔ نوازش ہو گی۔

آپ کو عامر بن علی، ناز اوکاڑوی صاحب اور دیگر احباب کو سلام عرض ہے۔

خیر اندیش

آفتاب خان

لاہور

جناب حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ معذرت کے ساتھ، اگرچہ تاخیر سے لیکن دو غزلیں بھیج رہا ہوں۔ تاکہ آپ کے اعلیٰ ماہنامہ ''ارژنگ'' کی ایک پرکشش زینت بن سکیں۔ اُمید ہے کہ آپ کے پرخلوص جذبوں کے ساتھ جلد از جلد ان کو اشاعت میں جگہ ملے گی۔

آپ کا مخلص

سہیل یار

محترم جناب حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ ''ارژنگ'' سے میرا تعارف دستگیر بھائی (دستگیر شہزاد) کی بدولت ہوا۔ بلاشبہ ماہنامہ ''ارژنگ'' اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کی علمی و ادبی پیاس بجھا رہا ہے۔ ان کے ذوق کی آبیاری کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دن دُگنی رات چگنی ترقی دے۔ (آمین)

میں اپنی ایک نظم ''میرا پیار مجھے واپس کر دو'' بھیج رہی ہوں۔ اُمید ہے آپ کے معیار پر پوری اُترے گی اور ارژنگ میں جگہ پائے گی۔ اللہ آپ کو زندگی کی سچی خوشیاں نصیب کرے۔ (آمین)

والسلام/شازیہ محسن

اورینٹل کالج کی ایک طالبہ آمنہ ولدار نے پروفیسر محمد اکرم صاحب جو پنجابی سہ ماہی رسالہ ''پنجابی'' کے ایڈیٹر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ پنجابی ادب کے لیے ان کی بے انتہا کاوشیں ہیں۔ بالخصوص اپنے نانا مرحوم ڈاکٹر فقیر محمد فقیر کی ادبی خدمات اور شخصی کردار کو عوام تک رسائی دینے کے لیے رات دن ہمہ تن مصروف ہیں۔ انٹرویو پنجابی میں لیا گیا ہے۔ قارئین اُردو ادب تک جنید اکرم کی محنت اور پیغام پہنچانے میں ناز اوکاڑوی نے اُردو قالب میں ڈھالا ہے۔

ہماری ثقافت یا رہن سہن میں بے حسی عام ہو چکی ہے

بدقسمتی سے ہماری لیڈرشپ جاہلانہ اور غلامانہ سوچ کی مالک ہے

ان کے ساتھ علمی ادبی مسئلوں پر بات کرنا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہے۔ پروفیسر جنید اکرم

پروفیسر جنید اکرم نے بات چیت کا آغاز اس شعر سے کیا:

خس خس جنہاں قدر نہ میرا صاحب نوں وڈائیاں
میں گلیاں دا رُوڑا کوڑا، محل چڑھایا سائیاں

جنید اکرم کہتے ہیں کہ ''میں لاہور شہر میں پیدا اور پلا بڑھا۔ گوجرانوالہ میں انہوں نے بتایا ان کی تاریخ پیدائش ۲۹ مارچ ۱۹۶۳ء ہے اور میٹرک کی سند پر غلط اندراج کے باعث سارے سرکاری کاغذات پر (۱۹ مارچ ۱۹۶۳ء) لکھی گئی ہے۔ انہوں نے ثبوت کے طور پر اپنے والد محترم مرحوم کی ذاتی لکھی ہوئی ڈائری دکھائی جس سے جنید اکرم کی غلطی کی نشاندہی کی تصدیق ہوتی ہے۔ جنید اکرم صاحب کے والد گرامی کا نام میاں محمد اکرم اور والدہ ماجدہ کا نام فہمیدہ اکرم ہے۔ ان کے آباؤ اجداد جموں کشمیر کے ایک گاؤں ''راول پور'' سے ہجرت کر کے 1857ء کے ہنگاموں کے دوران سیالکوٹ سے ہوتے ہوئے گوجرانوالہ کے ایک محلّہ ''تکیہ معصوم شاہ'' میں آ کر آباد ہوئے۔ ان کے آباء حکمت (طب) کا کام کرتے تھے۔ ذات کے ٹھاکر تھے۔ ان کی معلومات کے مطابق ان کے لکڑ دادا سے بھی پہلے کٹر مذہبی ہندو ذہنیت کے لوگ تھے۔ ان کے پڑدادا حکیم میاں امام دین ٹھاکر کے والد گرامی حکیم محمد بخش ٹھاکر نے اوّلاً اسلام قبول کیا۔ بعد ازاں متعصب ذہن کے مالک ہندوؤں کے ظالمانہ رویوں سے تنگ آ کر اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔

محمد جنید اکرم کے والد میاں محمد اکرم پنجاب حکومت کے محکمہ پولیس میں اکتالیس سال نوکری کر کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے 1980ء میں ریٹائر ہوئے۔ محکمہ پولیس میں ان کے والد محترم کو نہایت محنتی اور دیانت دار افسر کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔

محمد جنید اکرم صاحب 1979ء میں گورنمنٹ ملت ہائی سکول گوجرانوالہ سے میٹرک پاس کر کے گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج سٹیلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ میں داخلہ لیا۔ 1983ء میں اسی کالج سے بی اے کا امتحان پاس کر کے پنجاب یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد لاہور پنجاب یونیورسٹی سے ایل ایل بی اور اورینٹل کالج سے ایم اے پنجابی کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اسی تعلیمی عرصہ میں ایم اے اُردو امتحان پرائیویٹ اُمیدوار کی حیثیت سے پاس کیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے نیو کیمپس (قائداعظم کیمپس) کے بوائز ہاسٹل نمبر 14 (چوہدری رحمت علی ہال) کے کمرہ نمبر 116 میں ایک سال بعد ازاں کمرہ نمبر 121 میں پانچ سال کا عرصہ گزارا۔ بعد میں ضلع کچہری گوجرانوالہ میں وکالت شروع کی۔ مگر یہ سلسلہ تادیر نہ چل سکا تو 31 مئی 1989ء میں پنجاب حکومت کے محکمہ فنی تعلیم میں اُردو شارٹ ہینڈ اور ٹائپ کاری کی اُستاد کی حیثیت سے ذمہ داریوں کا آغاز کر دیا۔ اس کے بعد پنجاب پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کر کے انسٹرکٹر اُردو شارٹ ہینڈ پھر دوسری بار پنجاب سروس کمیشن کا امتحان پاس کر کے اردو زبان اور ادب کے استاد کی حیثیت سے پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کر دیا۔ محمد جنید اکرم سے بات کرتے ہوئے پوچھا:

ارژنگ: آپ نے کس وقت لکھنا شروع کیا؟

جنید اکرم: 11 ستمبر 1974ء کو جب حضرت بابا جی سرکار ڈاکٹر فقیر محمد فقیر صاحب نے اس فانی دنیا سے رحلت فرمائی اُس وقت میری عمر دس سال اور چھ ماہ

تھی۔ میرے والد گرامی گھر میں اُٹھتے، بیٹھتے اکثر بابا جی (ڈاکٹر فقیر محمد فقیر) کی رباعیاں ترنم کے ساتھ پڑھتے ہوئے آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے۔ بس اُسی وقت میرے دل میں ایک سوچ اُبھری کہ بابا جی کوئی مہان ہستی ہیں۔ پانے گھے، نیلے تارے اور صدائے فقیر کو بلند آواز ترنم کے ساتھ پڑھتے ہوئے ان کی تحریروں کو اپنے دل میں بسیرا کرنے کا خیال ہر وقت ذہن میں رہنے لگا۔ دوڑتا ہوا وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میٹرک کا امتحان سر پر آن پہنچا۔ امتحان سے فراغت کے بعد تین ماہ نتیجہ کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ اس فارغ وقت میں کھیل کود کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا ذوق بھی بطرف خدا عود کر گیا۔ اسی دوران ایک مضمون بعنوان "بابائے پنجابی ڈاکٹر فقیر محمد فقیر" لکھ کر لاہور روزنامہ "نوائے وقت" کو ارسال کیا۔ ان دنوں ہم گوجرانوالہ میں ہی مقیم تھے۔ یہ مضمون میرے لکھنے کی ابتدا تھی۔ یہ 1979ء کی بات ہے۔ کچھ دیر بعد مضمون چھپا تو سہی لیکن غلطی سے "محمد اکرم جنید" چھپا ہوا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ایک قومی اور کثیر الاشاعت روزنامہ میں چھپا اپنا مضمون دیکھ کر جو خوشی ہوئی وہ ناقابل بیان ہے۔

ارژنگ: مہینہ وار "پنجابی" کب چھپنا شروع ہوا۔ تفصیل سے بتائیں۔

جنید اکرم: یہ رسالہ ستمبر 1951ء سے بابائے پنجابی نے شروع کیا۔ میری کھوج کے مطابق اپریل 1960ء تک چھپتا رہا۔ اگر اس کے بعد کوئی شمارا چھپا ہو تو وہ مجھے ملا نہیں۔ میری تحقیق کے مطابق 1960ء کے بعد بند ہو گیا تھا۔ 38 سال بعد بابا جی سرکار کی نظر کرم سے اس حقیر، فقیر کو روحانی طور پر اجازت اور توفیق ملی تو ستمبر 1998ء سے بابا جی کے پاک پاؤں کی مٹی سے نئے سرے سے "پنجابی" سہ ماہی شائع ہونا شروع ہوا۔

میں جب پنجابی کا اجازت نامہ (ڈکلیریشن) حاصل کرنے کے لیے پریس برانچ کے دفتر درخواست لے کر گیا تو پتہ چلا اس نام کا اجازت نامہ پہلے سے طارق فاروق نامی ایک صحافی کے پاس ہے۔ طارق فاروق لاہور کے رہنے والے بھلا مانس دوست تھے "جہاں نما" نام سے ایک روزنامہ اخبار اور "پلک" کے نام سے مہینہ وار رسالہ چھاپتے تھے۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے آمین۔ جوانی ہی میں داغ مفارقت دے گئے تھے۔ میں نے ان کی منت سماجت کی آپ تو پنجابی نہیں چھاپ رہے اس کا اجازت نامہ مجھے دے دیں۔ انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میرا ارادہ اس کو چھاپنے کا ہے۔ ساتھ یہ تجویز بھی دی کہ آپ بطور ایڈیٹر کام کر سکتے ہیں اور اجازت نامہ میرے پاس ہی رہنے دو۔ میں نے انہیں اپنی روحانی وراثت بتا کر اس کے ساتھ اپنی دلی اور جذباتی وابستگی ظاہر کی تو ان کا دل پسیج گیا۔ بالآخر وہ مان گئے اور ٹرانسفر لیٹر پر دستخط کر دیے۔ سرکاری کارروائی پوری ہونے کے بعد اجازت نامہ میری بیوی مصباح جنید کے نام الاٹ کر دیا گیا۔

میں نے جولائی، اگست، ستمبر 1998ء سہ ماہی پہلا شمارا چھاپا۔ اس عرصے میں 9 شمارے چھاپے۔ ستمبر 2002ء سے "پنجابی" کو مہینہ وار چھاپنا شروع کیا۔ یہ سلسلہ شروع تھا کہ دسمبر 2006ء کو مشیت الٰہی سے مجھے گردوں کا مرض لاحق ہو گیا۔ یوں سمجھئے کہ "پنجابی" کے گردے فیل ہوئے۔ اس کے بعد رسالہ کچھ دیر ڈائیلاسز کے باعث رُکا رہا۔ جیسے ہی چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو "پنجابی" میں بھی جان آ گئی۔

میرے روحانی قبیلے کے معروف شاعر اور میرے بڑے بھائی جیسے دوست جناب کبیر احمد بھٹی المعروف بیرا جی نے میری بیماری کے دوران کچھ شماروں کی ایڈیٹنگ کی مگر پروف پڑھنے کا کام میری تسلی نہ کر سکا۔ جس کے باعث مجھے رسالے کی اشاعت روکنی پڑی۔ میں 14 دسمبر 2006ء سے ہفتہ میں تین دن ڈائیلاسز کروانے جانے لگا۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ بقول ڈاکٹرز مرتے دم تک کروانا پڑے گا۔ اس بدبخت بیماری کے ساتھ جینا ہی مقدر بن گیا ہے۔ یہ اللہ پاک کا کرم اور میری طبیعت کا ڈھیٹ پن کہ میں اپنے کام سرانجام دیے جا رہا ہوں۔ ڈائیلاسز ہونے کے باعث شدید نقاہت نے کام کرنے کی سکت کافی کمزور کر دی ہے۔ لہٰذا کچھ دوستوں نے مل جل کر ہاتھ بٹانے اور رسالہ کو جاری رکھنے کا مشورہ دیا جیسے میرے جگری یار پروفیسر غلام محی الدین نے چھپوائی بھاگ دوڑ کا ذمہ اپنے سر لیا۔ میرے بھائی سہیل اکرم اور میاں شمیم الحق صاحبان نے مالی مدد فرماتے ہوئے میرا ہاتھ بٹایا اور اسی طرح بزم فقیر کی جانب سے دل و جان سے سرپرستی کرنے میں میرے بڑے بھائی اور دوست جناب سہیل منصور (ممبر فیڈرل پبلک سروس کمیشن) کی ہمت دلانے اور محبت نے مجھے پھر سے جوان کر دیا۔ اس دوران پاکستان بھر میں پنجابی بچوں کے لیے پنجابی زبان میں پچھلے اٹھارہ سال سے مسلسل چھپنے والے اکیلے ماہوار رسالہ "پکھیرو" کے بانی اور ایڈیٹر جناب سہیل اشرف نے مسلسل میری خیریت دریافت کر کے مجھے حوصلہ دیا اور کئی ماہ سے ہر شمارہ میں پنجابی بچوں سے میری صحت کے لیے دعائیں کروا کر بالآخر اپنے کام کے لیے بھاگ دوڑ کے قابل کر دیا۔

یہ سب تفصیل تاریخ کا حصہ بنانے کے لیے

بیان کی گئی۔ ستمبر 2011ء سے ''پنجابی'' سہ ماہی دورانیے سے چھپ رہا ہے۔ پچھلے سال 2011ء میں مکمل چار شمارے چھپے۔ اس سال 2012ء سے جنوری سے جون تک دو سہ ماہی کا ایک شمارہ چھپا اور اب یہ دوسرا شمارا جولائی سے دسمبر 2012ء تک کا دو سہ ماہی شمارا ہوگا۔ ''پنجابی'' کے بابائے پنجابی کے دور میں پینتالیس شمارے چھپے اور ہمارے دور میں آپ کے ہاتھوں پچاسواں شمارا ہے۔

ارژنگ: پنجابی کو جاری کرنے میں آپ کو کیا کیا مشکلات پیش آئیں۔

جنید اکرم: کوئی مشکل نہیں ایک بات میں کئی بار کر چکا ہوں کہ رسالہ چھاپنا کام ہے یا کاروبار یا عشق۔ کاروبار ہو تو نقصان بھی ہوتا ہے اور منافع بھی۔ لوگ منافع کی بات نہیں کرتے نقصان کا رونا پیٹتے ہیں۔ اگر آپ ماں بولی کے خدمت گار یا عاشق ہونے کے دعوے دار ہو تو یاد رکھیں عشق میں گھاٹا نہیں ہوتا۔ لہٰذا میرا دل میری ماں نے میری ماں بولی (الحمدللہ) دونوں کے عشق میں رنگا ہوا ہوں۔ اسی لیے میری راہ میں کوئی مشکل نہیں اور کوئی رکاوٹ مجھے روک نہیں سکتی۔ عام طور پر ہمارے ایڈیٹر بھائی اس بات کا شکوہ کرتے ہیں کہ لوگ رسالہ مفت لینا پسند ہیں سالانہ ممبر نہیں بنتے۔ یہ بات سو فیصد درست ہے۔ یہ ہماری ثقافت کا المیہ ہے کہ لوگ ہر طرح کی فضول خرچی تو کر لیں گے لیکن پڑھائی لکھائی کا کام مفت میں کرنا پسند کرتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ گزرے ہوئے سڑسٹھ سالوں میں لکھائی پڑھائی مراد تعلیم کو ساتویں یا آٹھویں نمبر پر رکھا ہوا ہے۔ کچھ لوگ احساس کمتری اور احساسِ غلامی میں اس قدر دبے ہوئے ہیں کہ بچوں کو فر فر انگریزی پڑھنی اور بولنی آ جائے تو پڑھائی والا خانہ پُر ہو جائے۔ میرا ایک شعر ہے:

میں تعلیم دا ایتھوں حکر قائل آں
بس بالاں نوں انگلش بولنی آ جائے

گا یسے کم عقلوں کی کم عقلی کا کسی کے پاس کوئی حل نہیں۔ ہاں البتہ ایک اور شعر میں ناصحانہ انداز کی کوشش کی اور ہر شمارے کے پہلے صفحہ پر لکھنا شروع کر دیا۔

تیری ماں بولی اے بیبا! لکھاں وانگ نہ رول
پڑھ پنجابی لکھ پنجابی، غیرت مندا! بول پنجابی

ایسے مسائل کے باوجود جو صاحب مجھے لکھنے پڑھنے کا شوقین ہو میں اُسے رسالہ بھیجنا کبھی بند نہیں کرتا۔ ایسے کام کے لیے کسی سے شکریہ یا مہربانی جیسے لفظوں کی نہ تو ضرورت نہ آس اُمید۔ ''پنجابی'' کو چھاپنا میرا عشق اور پڑھنے والوں تک پہنچانا بالفرض کام ہے۔ میں رب کے سوا کسی سے آس نہیں رکھتا۔ کیونکہ آس ٹوٹنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ بس ایک بات پہ عمل کرتا ہو۔ کام، کام بس کام

ارژنگ: پنجابی رسالوں کی اشاعت تعداد کتنی ہوگی؟

جنید اکرم: یہ رسالے کے مواد اور چھپائی کے معیار پر منحصر ہے۔ اگر آپ اچھی معیاری نگارشات اکٹھی کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور رسالے کے لیے ڈیزائننگ کے لیے اچھا ڈیزائنر مل جائے چھپائی معیاری اور دلکش ہو تو رسالے کی مارکیٹنگ اچھے طریقے سے کر سکیں تو پنجابی ادبی رسالوں کے پڑھنے والے اُردو سے زیادہ مل جاتے ہیں۔

ارژنگ: آپ پروفیسر اُردو کے مگر آپ کا مشن پنجابی زبان کا فروغ، یہ تضاد کیوں؟

جنید اکرم: بیٹا! یہ تضاد نہیں مگر حقیقت ہے۔ عشق و مستی آقا حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جگہ فرمایا:

دست ہر نا اہل بیمارت کنند
سوئے مادر آ کہ تیمارت کنند

میں نے بھی اپنی پڑھائی کی ابتدا اُردو اور انگریزی سے ہی کی۔ بلکہ یونیورسٹی کی طالب علمی سے جڑی ایک کہانی میری ہڈ بیتی بھی تھی۔ وہ انگریزی زبان میں لکھی جس کا عنوان "She" رکھا۔ میرے کچھ دوستوں نے پسند بھی کیا مگر نہ جانے کیوں اور کیسے میرا قلم دیکھتے دیکھتے ماں بولی کی طرف مڑ گیا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ میرا اُٹھنا بیٹھنا ہی پنجابی زبان کے ساتھ ہو گیا۔ اب تو یہ میری محبوبہ بن چکی ہے۔

ارژنگ: کیا پنجابی زبان کا اردو کے ساتھ کوئی اختلافی نکتہ بھی ہے؟

جنید اکرم: اردو زبان اور لسانیات کے کھوج اس کھوج سے اتفاق کرتے ہیں کہ اُردو زبان پنجابی زبان سے ہی نکلی یا پیدا ہوئی اور پچھلے تین سو سالوں میں پلی بڑھی اور جوان ہوئی۔ گویا دونوں زبانوں کا رشتہ ماں، بیٹی جیسا ہے۔ آپ بھی سوچیں کہ ماں بیٹی میں کیا اختلاف ہو سکتا ہے۔ ایسی باتیں کچھ شر پسند لوگوں کی پیدا کردار ہیں۔ میں یہ کہوں گا کہ طالب علموں کو ایسی منفی سوچوں سے دور ہی رہنا چاہیے۔

ارژنگ: آج کل کی حکومت دیکھنے میں پنجابی زبان کے پھیلاؤ کے لیے کندھے سے کندھا جوڑے ہوئے ہے۔ مگر حقیقت میں اس کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ جیسے کچھ عرصہ قبل لیکچراروں کے لیے سات سو زیادہ نوکریاں منظرِ عام پر آئیں۔ ان میں سے ایک بھی سیٹ پنجابی زبان کی نہ تھی۔ حالانکہ آج بھی پنجاب

کے بے شمار کالجوں میں پنجابی پڑھانے کے لیے ایک بھی اُستاد موجود نہیں اور طالب علموں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ اس بارے آپ کیا کہیں گے۔

جنید اکرم: ہماری ثقافت یا رہن سہن میں بے حسی عام ہو چکی ہے۔ بدقسمتی سے ہماری لیڈر شپ جاہلانہ اور غلامانہ سوچ کی مالک ہے۔ ان کے ساتھ علمی، ادبی مسئلوں پہ بات کرنا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہے۔ جن مسئلوں کی آپ بات کر رہی ہیں ان کے بارے بات کرنا حکمرانوں سے مذاکرات کرنا، لیکچراروں کی نوکری میں حصہ نکالنا جیسے کام میں سمجھتا ہوں ان ساری یونیورسٹیوں اور کالجوں کا فرض ہے جہاں متعلقہ مضمون کی ایم اے، ایم فل اور پی ایچ جیسی ڈگریاں دی جا رہی ہیں۔ یہ سوال آپ ان یونیورسٹیوں کے پنجابی زبان اور ادب کے شعبہ جات میں بیٹھے ان افسرانِ بالا اور چیئرمینوں سے پوچھیں جن کے اپنے گریڈ پر ہر ایک کو بناتے تو ہیں مگر ان کی کارکردگی کیا ہے؟ ہر سال ایم اے پنجابی کی چالیس، پچاس ڈگریاں تقسیم کر کے اپنے معاشرے میں مزید بے روزگار پیدا کرنے کی بجائے یا سرکارے دربارے اپنی آواز پہنچانے اور اپنے مضمون کی نوکریوں کا حصہ لینے یا پھر احتجاج کے طور پر اپنی نوکریوں سے استعفیٰ دے دیں۔

ارژنگ: اگر ایم اے پنجابی کر کے بیکار ہی سڑکیں ناپنی ہیں اور کوئی نوکری ملنی نہیں تو ایم اے پنجابی کیوں کریں۔ جبکہ ایم اے پنجابی کی یونیورسٹیوں میں یہ شعبے بند ہی کر دینے چاہئیں۔

جنید اکرم: بیٹا! اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے۔ آپ صرف ایم اے پنجابی کر کے ہی بے روزگار نہیں ہوتے اس ملک میں فزکس، کیمسٹری، بیالوجی، میتھ، اُردو، تاریخ کے علاوہ سیکڑوں مضامین کے نام لے سکتے ہو۔ سب نوجوان ڈگریاں لے کر بیکار پھر رہے ہیں۔ یہ مسئلہ پنجابی کا نہیں ہمارے ملک کے معاشی نظام کا ہے۔ اس کے اقتصادی اور معاشی نظام کو درست کرنے کی اشد ضروری ہے۔ دوسری طرف یونیورسٹی سطح پر پنجابی کے نصاب کو نئے زمانے کے مطابق درس وتدریس کے علاوہ دوسرے شعبوں کے لیے ایم اے پنجابی لڑکے لڑکیوں کی ضرورت کو ضروری ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ یونیورسٹی کے عالم فاضل اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ یہ کام کریں اور دفتر کے مروّجہ خواتین کے تحت نوکری کے لیے آئیں۔ درخواستوں کو حکام بالا تک پہنچائیں۔ اگر ان کی بات نہ سنی جائے تو پھر متبادل طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔

ارژنگ: سر! ہم کسی کو کیا بتائیں کہ ایم اے پنجابی کر رہے ہیں۔ لوگ سن کر ہنستے ہیں۔ لوگوں کی سوچ ہے کہ اب ہر پڑھا لکھا دانشور کیا ہے۔ انگریزی پڑھو لکھو۔ اگر کچھ اور نہیں تو اُردو ہی پڑھ لیں مگر آپ پنجابی کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ گلوبلائزیشن کے دور میں پنجابی کہ انگریزی؟

جنید اکرم: بیٹا! ایسے پڑھے لکھے جاہل لوگوں کی جاہلانہ سوچ پر انا للہ وانا الیہ راجعون ہی پڑھا جا سکتا ہے۔ ایسے بے عقل لوگوں کو غیرت مند بنانے کے لیے بتانا چاہیے کہ دنیا بھر کی غیرت مند قوموں نے اپنی آڑھی ترچھی زبانوں کو بھی گلوبلائزیشن کا حصہ بنا کے اپنے آپ کو زندہ اقوام ثابت کرایا۔ مگر آپ اپنی زندہ اور تابندہ زبان کا گلہ دبانے کی باتیں کر رہے ہیں۔ اگر میں ان کم عقل لوگوں کی یہ غلط بات ایک لمحے کے لیے مان بھی لوں کہ ''پنجابی سائنسی موضوعات کو بیان نہیں کر سکتی تو پھر بھی ایسے ''غیرت مند دانشوروں'' کو یہ بات سمجھانے کی ضرورت ہے۔ اگر اپنی ماں بیمار ہو جائے تو غیرت مند اولاد اس کا علاج کرواتے ہیں، خدمت کرتے ہیں تا کہ اسے گھر سے نکال باہر کر کے ہمسایوں کی ماں کو ماں کہنا شروع کر دیں۔ اب اس بات کی کوشش کریں کہ اپنی مادری زبان پنجابی کو گلوبلائزیشن کا لازمی جزو ثابت کرنے کے لیے اور بنانے کے لیے کیا کرنے کی ضرورت ہے، کو سب مل جل کر وہی کرنے میں لگ جائیں۔

ارژنگ: سر! یہ بھی پرابلم ہے کہ ہمارے اکثر لوگ بولتے ہوئے لکھ، پڑھ نہیں سکتے۔ اس مشکل کا کیا حل ہے؟

جنید اکرم: میری رانی بیٹی! تم بہت بھولی ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ ولایت (انگلینڈ) کے سارے لوگ انگریزی بولتے ہیں کیا وہ سب انگریزی لکھ پڑھ لیتے ہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ دنیا میں کوئی زبان بھی ایسی نہیں جس کو بولنے والے سارے لوگ اُسے پڑھنا بھی جانتے ہوں۔ کسی بھی زبان کو پڑھنے لکھنے کے لیے اس زان کی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا جو پنجابی زبان کو پڑھنا، لکھنا چاہتا ہو اسے اس کی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا جو پنجابی زبان کو پڑھنا لکھنا چاہتا ہو اسے اس کی تعلیم حاصل کرنی پڑے گی۔ ہر زبان کا یہی اصول ہے۔

ارژنگ: بعض لوگ پنجابی کے مختلف لہجوں کو الگ زبان تصور کرتے ہیں جیسے سرائیکی یا ہندکو وغیرہ۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

جنید اکرم: یہ ایک سیاسی نعرہ ہے آنے والے وقتوں میں پنجاب کے دو تین صوبے بنانے کی گندی سازش پوری ہوتی نظر آ رہی ہے اور زبان کے ساتھ بھی اچھا سلوک ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ میں اپنی رائے بتانا چاہوں گا۔

ع سچ آکھیاں بھانبڑ مچدا اے

والی بات ہوگی۔ حقیقت یہی ہے کہ اس سارے ملک میں پنجاب کی یہی ایک زبان تو وہ ہے پنجابی۔ ہر بڑی زبان کی طرح پنجابی کے بھی کچھ لہجے ہیں۔ لہجہ زبان نہیں ہوتی اس لیے ایک ہی زبان تصور ہوگی، پنجابی۔

ارژنگ: پنجابی زبان کی املا کا مسئلہ کیوں حل نہیں ہو رہا۔ ہر رسالہ اپنی علیحدہ املا بنا کے کام چلا رہا ہے؟

جنید اکرم: اس کے پیچھے میرے خیال میں کچھ پنجابی دشمنوں کا ہاتھ ہے جن کی آشیرباد سے کچھ ہمارے پنجابیوں نے ''میں نہ مانوں'' کا رویہ اختیار کیا ہوا ہے۔ اپنی ہر بات منوانے کی ضد دراصل احساس کمتری کا شکار ہونے والی بات ہے۔ اگر چار بھائی مل جل کر کچھ باتوں پہ اتفاق کرلیں تو ایک ہی میٹنگ میں مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ ہمارے رہن سہن کا مشترکہ مسئلہ آپس میں نااتفاقی اور ہٹ دھرمی ہے۔ جس کا کسی کے پاس حل نہیں۔

ارژنگ: کیا پنجابی کا ٹھیک رسم الخط گرمکھی ہے؟

جنید اکرم: لاحول ولا قوۃ الا باللہ! یہ فتویٰ کس نے دے دیا؟ یہ کسی احمق کی بات تو ہوسکتی ہے۔ کسی بھی زبان کا سکہ بند لب ولہجہ وہ ہوتا ہے جو اس زبان کے سکہ بند اُستاد شاعروں نے برتا ہو اور پنجابی زبان کے ہر عہد کے اساتذہ کا کلام سامنے رکھیں۔ حضرت بابا فریدؒ، شاہ حسینؒ، پیر وارث شاہؒ، بلھے شاہؒ، خواجہ غلام فریدؒ، حضرت سلطان باہوؒ اور بابا گورو نانک سے لے کر بیسویں صدی کے سارے اساتذہ کرام کا کلام پڑھیں گرمکھی تو دور کی بات آپ کو ان شاعروں کے کلام میں عربی، فارسی کے اثرات نظر آئیں گے۔ میری تحقیق کے مطابق ''گرمکھی'' رسم الخط نہیں بلکہ ایک الگ زبان ہے۔ اسی اثنا ایک واقعہ بتانا چاہوں گا۔ میں چنڈی گڑھ انڈیا میں ہونے والی بین الاقوامی پنجابی کانفرنس میں گیا۔ وہاں بہت بڑا اجتماع تھا۔ ہر جگہ گرمکھی میں لکھے بینر نظر آ رہے تھے۔ جو لوگ سٹیج پر آ کر تقریریں کر رہے تھے ان کی زبان کے الفاظ ہماری سمجھ سے باہر تھے۔ جب میری باری آئی تو سارا پنڈال اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہوا یوں کہ میں نے بات شروع کرتے ہی کہا دوستو! یہ انٹرنیشنل پنجابی کانفرنس نہیں بلکہ انٹرنیشنل گرمکھی کانفرنس ہے۔ جو زبان میں آج یہاں سن رہا ہوں یہ آج تک نہ پنجاب میں سنی نہ پنجابی کے کسی اُستاد اور مہان شاعر کے کلام کو اس زبان میں پڑھا۔ حتیٰ کہ ہمارے دیس کے مہان توحید پرست نے نظریہ توحید کے مہان پرچارج حضرت بابا تک کی بھی نہ یہ زبان تھی نہ ہے نہ یہ لب ولہجہ نہ یہ رسم الخط اور نہ یہ املا۔ آپ نے تو ہر شے اتنی بگاڑ دی ہے کہ یہ کوئی اور زبان کہی جاسکتی ہے کم از کم میں تو اسے ماننے کے لیے تیار نہیں۔ بس پھر سکھ شیر جوانوں نے شور مچا کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ میں نے بھی ہار نہ مانی۔ میں نے کہا شور مچانے کی بجائے ایک ایک کر کے آپ سوال کریں ہر ایک کی تسلی تشفی کر کے جاؤں گا۔ میرے ساتھ سٹیج پر انڈین پنجاب کے مہان قلم کار اور استاد پروفیسر پریتم سنگھ بیٹھے تھے۔ انہوں نے بات بڑھتے دیکھی تو اٹھ کر مائیک پر آ گئے۔ مجھے ایک طرف کر کے شور مچانے والے نوجوانوں کو بیٹھنے کا اشارہ کر کے بات شروع کر دی۔ حضرت بابائے پنجابی سے میری نسبت کے حوالے سے میرا تعارف کراتے جب یہ کہا کہ ''میں ان کی بات سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔ آج یہ بھی اعتراف کرنا پڑے گا جو پنجابی آج کی نسل جو پنجابی پڑھتے پنجاب میں لکھ رہے ہو یہ تو یہاں رہتے ہوئے مجھ جیسے پڑھے لکھے کے پلے نہیں پڑتی۔ تو واہگہ کے اس پار والوں کو کیا سمجھ آئے گی۔ اس سے میرا حوصلہ دو چند ہوا اور میری اس بات کو خوب سراہا گیا۔ سو گرمکھی، گرمکھی ہے اور پنجابی پنجابی ہے۔ پنجابی پنجابی دیس کے ولیوں، قلندروں، درویشوں، صوفیا اور فقیروں کے گھر پلی بڑھی زبان ہے۔ اسے کسی گرو کے مکھ کی ضرورت نہیں۔ اس کا رکھوالا رب ہے۔ تو اسے وہی اس کی حفاظت کرنے والا ہے۔ (انشاءاللہ)

ارژنگ: ایک ایڈیٹر کی کیا ذمہ داریاں ہوتی ہیں؟

جنید اکرم: حضرت بابائے پنجابی کا فرمان ہے ''قلم کی ایک صحیح جنبش کئی ہزار ننگی تلواروں سے بڑھ کر طاقت ور ہوتی ہے۔ بس اس ایک جملہ میں ایک ایڈیٹر کی ساری شخصیت موجود ہے۔ جسے قلم کی طاقت، اہمیت، افادیت اور ضرورت کی پہچان اور قدر ہے وہ اچھا ایڈیٹر ہوسکتا ہے۔

ارژنگ: آپ اپنے رسالہ میں پنجابی زبان کے کلچر کو زندہ رکھنے کی بات کرتے ہیں اُس کی کیا وجہ ہے؟

جنید اکرم: کلچر ادب کو اور ادب کلچر کو جنم دیتا ہے۔ جو اقوام اپنی زبان اور کلچر سے منہ موڑ لیں تاریخ ان سے منہ موڑ لیتی ہے۔ یاد رکھیں قومیں اُس وقت تک زندہ رہتی ہیں جب اپنی زبان اپنی تہذیب کی محافظ بن کر زندگی گزاریں۔ اس لیے میرا مؤقف ہمیشہ یہی رہا ہے کہ جیسے زبان کی حفاظت ضروری ہے اسی طرح پنجابی ثقافت زندہ رکھنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

ارژنگ: آخر میں آپ آج کے طالب علم کو کوئی پیغام دیں گے؟

جنید اکرم: حضرت قائداعظم محمد علی جناح صاحب کا لاثانی اور لافانی پیغام آپ کو یاد دلا دیتا ہوں۔ انہوں نے ایک لفظ کو تین بار دہرا کر ساری قوم سے کہا تھا۔

کام، کام صرف کام

گل بات

انٹرویو: ناز اوکاڑوی

بدقسمتی نال پنجابی زبان بریڈ ونگ (Bread winning) زبان نہیں بن سکی

سرکاری ادارے خاص حداں وچ کم کر دے نیں

چنگی شاعری لئی جدید تے شعری Sensibility آت ضروری اے

پنجابی اک جیوندی جاگدی زبان اے

پنجابی لپیاں دی گل کون دا کوئی فیدا نہیں جو ہونا سی ہو چکیا سانوں شاہ مکھی املا دی اکسار تا ول دھیان کرنا چاہی دا اے

دھرتی ماں تے ماں بولی دی گل کرن والا ہر جی میرے لئی صاحب اے

پنجابی ادارے چلان والے اپنی جیب وچوں خرچدے نیں

جدوں تک املا بارے اجتماعی فیصلہ سامنے نہیں آ جاندا اودوں تک سبھ ٹھیک نہیں

ڈاکٹر نوید شہزاد شعبہ پنجابی پنجاب یونیورسٹی لاہور نال استاد دی حیثیت نال وابستہ نیں۔ اوہناں دیاں ہن تک اک درجن توں ودھ تحقیقی، تنقیدی کتاباں جو کہ درجن دے لاگے شعری پراگے چھپارے چڑھ چکے نیں۔ اوہ نویں پنجابی نظم دے حوالے نال رجحان ساز شاعر دے طور تے جانے جاندے نیں تے ایس حوالے نال اوہناں دے چار نظم پراگے ''ترلوک، کنک ریتاں دی کوتا، ظہیر الدین شفیق لئی نظماں تے فشنگ لائن'' چھپ چکے نیں۔ اوہ پچھلے کجھ عرصے توں تاریخی لسانیات دے حوالے نال کم کر رہے نیں جس دا اک سلسلہ ''سویر انٹرنیشنل'' راہیں سامنے وی آ چکیا اے۔ ایسے لئی انٹرویو وچ اوہناں توں پنجابی زبان دی صورت حال بارے بوہتے سوال پچھے گئے تاں جے اسیں پنجابی زبان دی موجودہ حالت نوں تاریخ دی روشنی وچ سمجھ سکیے۔ (ناز اوکاڑوی)

س: موجودہ نسل اپنی ماں بولی نوں بولن، لکھن، پڑھن توں کیوں کتراندی اے؟

ج: ایہدے وچ اوہناں دا کوئی قصور نہیں۔ جیہو جہی زمین ہووے او ہو جہی فصل اُگے گی۔ وڈا توں پہلاں جو زمین تیار ہو چکی سی اوسے دی اُگائی بھگت رہے آں۔ فارسی حملہ آوراں ایہ کم شروع کیتا سی۔ اوہناں قبضے مگروں ایتھوں دی سرکاری درباری زبان فارسی نوں بنایا۔ فارسی سرکارے دربارے ایتھوں تیک پردھان سی کہ پنجاب دا پنجابی حاکم وی ایس توں پچھا نہ چھڑا سکیا۔ رنجیت سنگھ پڑھیا لکھا وی نہیں سی، ایہہ وی ٹھیک اے کہ اوہدا بوہتا ویلا پنجاب دیاں سرحداں کھلیاں کرن تے اندر لے امن دی اُساری وچ لنگھیا۔ خورے ایسے لئی اوس کول مقامی زبان دی پردھانگی قائم کرن لئی کوئی باقاعدہ سوچ یا پروگرام نہیں سی۔ فرنگی نے کجھ ہور ڈھنگ اپنایا۔ اوس نے عوام تے اپنے وچکار دلالاں دی اک جماعت پیدا کیتی۔ راجے، مہاراجے، نواب، سر تے ذیلدار وغیرہ دی صورت وچ پیدا کیتے ایناں دلالاں نوں مراعات دتیاں گئیاں۔ اوہناں ملکی اداریاں نوں انہاں دلالاں دی لونڈی بنایا جیہں تک رسائی لئی عوام نوں دلالاں اگے ہتھ پھیلانا پیندا سی۔ عام طور تے نو آبادیات وچ ایسے طرح ای ہوندا اے۔ ایہ دلال مراعات یافتہ ہون پاروں آپ وی انگریزی سکھدے تے انہاں دیاں نویاں نسلاں وی حاکم دے قائم کیتے اوہناں تعلیمی اداریاں وچ تعلیم حاصل کر دیاں جتھوں نکلن مگروں حاکم طبقے وانگوں ای اوہناں دا رنگ ڈھنگ ہو جاندا۔ ایہو ای حملہ آور قابض چاہ رہیا ہوندا اے کہ اوہ دیسیاں وچوں آپنیاں کاپیاں تیار کر سکے۔ حملہ آور قابض کدی وی اداریاں نوں مضبوط نہیں ہون دیندا۔ کیوں جے انج اونہاں دے قائم کیتے دلالاں دا کردار مک جاندا اے۔ جدوں لوک اداریاں نوں بلا واسطہ تنقید ہون لگ جان تاں فیر محتاجی مک جاندی اے۔ محتاجی مکے تاں اجتماعی آزادی پنگر دی اے جہڑی

اوہنوں کدی وی وارے نہیں آ سکدی۔ ایہو ای معاملہ زبان دا اے۔ کسے علاقے وچ اوتھوں دی مادری زبان دا ذریعہ تعلیم ہوون کدی وی ایس ذہنیت نوں وارا نہیں کھاسکدا۔ سوفرنگی حاکم نے پنجاب نوں اوس دی مادری زبان توں دور رکھن دا ہر ممکن آہر کیتا۔ کدی اردو ہندی تنازع راہیں پنجاب وچ مادری زبان دی جنگ نوں دبایا گیا تے کدی گرمکھی، شاہ مکھی جھیڑیاں راہیں جتھوں تیکر پاکستانی پنجاب دا معاملہ اے تاں ایتھے Language Politic وچ ملوث ہستیاں کدی وی زباناں دے مسئلے نوں لسانی یا علمی بنیاداں تے حل نہیں ہون دتا۔ ایہہ ہستیاں اردو زبان دے نفاذ دا جو فارمولا پیش کر دیاں رہیاں اوہ قومی یا رابطے دی زبان دے رائج دا فارمولا ہے ای نہیں سی۔ دراصل اوہ مقامی اریجنل زباناں نوں Replace کرن دا فارمولا سی۔ ایہو وجہ اے کہ اج تک اردو تے پنجابی وچ اک تناؤ دی کیفیت اے تے ایہہ گل دویاں زباناں چوں کسے دے حق وچ وی نہیں۔ دوہاں دے دائرہ عمل تے دائرہ اثر طے ہونے چاہی دے نیں۔ دوجی گل زبان اوہ بچدی تے عزت دی حقدار ٹھہردی اے جیس کول Bread winning Status ہوندا اے تے بدقسمتی نال پنجابی زبان نوں اپنی ماں دھرتی تے کدی وی ایہہ حیثیت نہیں ملی۔ ہمیشہ کماؤ زباناں ای قابل فخر تے قابل عزت سمجھی جاندیاں نیں۔ غربت دی ماری زبان نوں کوئی سینے نہیں لاندا۔ خاص طور تے مابعد نوآبادیات وچ جیہدا اسیں اج وی حصہ ہاں۔ فیر سٹیٹس سمبل وی کماؤ (Bread winning) زباناں ای بن دیاں نیں۔ مابعد نوآبادیات وچ جمن، پلن والیاں لئی Bread winning status less زبان کیویں سٹیٹس سمبل ہوسکدی اے۔

س: پنجابی زبان دی ترقی لئی تہاڈے خیال وچ کیہہ ہونا چاہی دا اے؟

ج: پنجابی زبان نوں پنجاب وچ Bread winning Status دنیا ہووے گا۔ ایہو ای ماں بولی دا حق ہوندا اے جیہڑا اوہنوں ملنا چاہی دا اے۔ پتر دھیاں سکی ماں نال ایسے لئی پیار کر دے نیں کہ اوہ اوہنوں دلوں ماں من دے نیں تے متریٔی ماں نال ایسے لئی فاصلہ رکھدے نیں پئی اوہنوں دلوں ماں نہیں من رہے ہوندے۔ ایہو ای کمٹمنٹ اے جیہڑی دلوں من نال پیدا ہوندی اے۔

س: اداریاں تے تنظیماں دا کیہہ کم ہونا چاہی دا اے؟ کیہ تسیں پنجابی اداریاں دے کم توں مطمئن اوہ؟

ج: پنجابی اداریاں وچ بوہتے تے پرائیویٹ ادارے نیں۔ اک پلاک ای اے۔ باقی یونیورسٹیاں تے کالجاں دے شعبے نیں جیہڑے خالصتاً تدریسی ادارے نیں۔ جے اوہ درس و تدریس توں وکھ کجھ ہور کر دے نیں تاں ایہہ سبھ لئی مان جوگ ہونا چاہی دا اے۔ پلاک جو کر رہیا اے ٹھیک اے۔ ایف ایم 95 وی جتھے میری اطلاع مطابق بوہتے متر بناں معاوضے دے کم کر دے نیں۔ اینوں ماں بولی دی خدمت ای آکھاں گے۔ سرکاری ادارہ خاص حداں وچ ای کم کر دے نیں تے ایہہ اوہناں وچ کم کرن والے ملازماں نوں وی متھیاں لیہاں تے ای لڑنا پیندا اے۔ ایس پاروں انہاں نوں بوہتا دوش نہیں دتا جا سکدا۔ پر جے کوئی ڈنڈی مارے تاں اوہنوں دوشی ٹھہرانا وی چاہی دا اے۔ باقی پرائیویٹ پنجابی ادارے تاں نمانے نیں۔ اوہناں دا تے اوہ حساب اے کہ ”گنجی نہاوے کیہ تے نچوڑے کیہ“ آفرین اے اوہناں تے فیر وی جو کر رہے نیں۔ ٹھیرا اے۔ میں مناسب نہیں سمجھدا کہ پنجابی اداریاں اُتے تنقید کیتی جاوے۔ سارے جن متر اپنیاں جیباں وچوں خرچدے رہے تے اج وی خرچ رہے نیں تے ایہہ سبھ لوک مڈل یا لوئر مڈل کلاس نال جُرت رکھدے نیں۔ وڈی گل اے، سلام کردا ہاں انہاں نوں۔ دھرتی ماں تے ماں بولی دی گل کرن والا ہر جی میرے لئی صاحب اے۔

س: پنجابی زبان ایس ویلے کہی پکھوں ونڈ دا شکار اے۔ تسیں کیہ آکھوگے؟

ج: ایہہ ٹھیک اے کہ پنجابی زبان دو لپیاں وچ ونڈی گئی، انج نہیں سی ہونا چاہی دا۔ میں ذاتی طور تے سمجھدا ہاں کہ کسے زبان دا دو لپیاں وچ ونڈیجن بدقسمتی اے اوس زبان دی۔ پر ہن ایہدا کوئی حل نہیں تے نہ ای ایس گل نوں موضوع بحث بنان دا کوئی فیدا اے۔ ساتوں شاہ مکھی دے حوالے نال املا دی اکسارتا ول دھیان کرن دی لوڑ اے تے ایہہ کوئی ایڈا اوکھا کم نہیں۔ اُنج وی املا زبان و ادب تے صحافت نال جڑے اداریاں دا مسئلہ ہوندا اے تے ایہہ اوہناں نوں ای حل کرنا چاہی دا اے۔ آس اے اپنی اپنی انا نوں اک بنے رکھ کے وڈے مقصد لئی رل بہن گے۔ جدوں تک کوئی اجتماعی فیصلہ نہیں ہو جاندا اودوں تک ستھے املاواں ٹھیک نیں۔

س: ایوارڈ ونڈن وچ جو گھپلے ہو رہے نیں اوہناں بارے تہاڈے کیہہ وچار نیں۔

ج: میں کدی انعام لین لئی نہیں لکھیا۔ مڈھلے دور وچ کئی وار کتاباں نوں انعام ملیا وی پر کیتاں در ہیاں توں ایہدے توں دور آں۔ میری ذاتی راء اے کہ ادارے انج نہیں کر دے۔ ہاں کوئی ذاتی حیثیت وچ ایس طرح دا کم کرسکدا اے۔

س: پنجابی ادب ایس ویلے جتھے کھڑا اے یا چل رہیا اے تسیں مطمئن او؟

ج: اطمینان نوں تاں میں چنگا نہیں سمجھدا، ایہنوں جمود سمجھدا ہاں۔ اندر چھتانہ ہووے تاں سٹر کن لگ جاندا اے۔ باقی رہی گل ادب دے معیار دی تاں میں پہلاں وی آکھیا کہ میری ماں بولی Bread winning Layring نہیں۔ ایس لئی پاکستانی دور وچ چنگے ذہن ایس پاسے گھٹ آئے۔ ایسے لئی روایت وچ ضم ہو جاون والیاں دی گنتی بوہتی اے۔ جگ دی ایہوای ریت اے۔ چنگے ذہن ہمتیں کماؤ زباناں دے ادب دی تخلیق وچ رُجھ جاندے نیں۔ صاف ظاہر اے ہر تخلیق کار ودھ توں ودھ پذیرائی سمیٹنا چاہندا اے۔ چاہے پذیرائی دی جو وی صورت ہووے بہر حال ہر زبان دے ادب وچ سارا ادب وڈیا نہیں ہوندا۔ ایہوای صورت پنجابی وچ اے۔

س: موجودہ پنجابی شاعری خالص پنجابی زبان وچ ہورہی اے۔

ج: ہر زبان کجھ عرصے مگروں اپنے کجھ لفظ متروکیت دے کھاتے پا دیندی اے تے دوجیاں زبان (خاص طور تے گوانڈھی زباناں) توں لئے ہوئے الفاظ اوویں دے اوویں یا کجھ بدلیویں نال قبول کرلیندیاں نیں۔ انج ہر زندہ زبان وچ ہوندا اے تے پنجابی اک جیوندی جاگدی زبان اے۔ دوجی گل ایہہ عمل فطری ہوندا اے جنوں روکنا ممکن نہیں ہوندا۔ جے کوئی لکھاری یاں ادارہ غیر پنجابی لفظاں نوں جان بجھ کے پنجابی زبان دا حصہ بناون وچ رُجھیا ہویا اے تاں اوہ یقیناً نندن جوگ اے۔ ایس طرح نہیں کرنا چاہی دا۔

س: کیہ ہر ادبی صنف پنجابی ادب وچ اپنی تھاں ملدی نظر آ رہی اے۔

ج: نظم تے نثر دوہاں وچ گھٹ ودھ ہر ادبی صنف لکھی گئی۔ پر پنجابی شاعری دا کھیتر فخر جوگ اے۔ بھاویں لوک شاعری ہووے تے بھاویں کلاسیکی۔ صوفیانہ یا نویں شاعری ایہہ وڈا ادب اے۔ باقی میں ذاتی طور تے صنفاں وغیرہ دی تھاں صرف دو ونڈاں دا ای حامی آں۔ اک چنگا ادب دوجا مندا ادب۔ میرے لاگے تخلیقی حوالے نال ودھ توں ودھ صنفاں نوں چھاما رکے چنگائی کرن وڈی گل نہیں سگوں وڈی گل کسے اک صنف وچ فکری، فنی نویکلتا منگر ان اے۔ ایہو راہ Trends نوں جنم دیندا اے۔ تے کسے وی زبان دا ادب Trend Setter Writers پاروں ای جمود توں بچدا تے اگے ودھدا اے۔

س: کیہ آزاد نظم پنجابی شاعری وچ تھاں بناندی نظر آ وندی اے؟

ج: گل آزاد، معریٰ یا نثری نظم دی نہیں کہ اوہ کس حد تک پاپولر اے۔ گل چنگی یا مندی شاعری دی اے۔ چنگی شاعری کسے وی شعری صنف وچ ہو سکدی اے۔ آزاد نظم یقیناً چنگی شاعری دی تخلیق وچ جو معاونت کردی اے اوہ پابند شاعری نہیں کردی۔ چنگی شاعری لئی جدید تے شعری Sensibility ات ضروری اے۔ جے ایہہ کسے نثری نظم وچ موجود اے تے کسے غزل وچ موجود نہیں تاں فیر سانوں منناپوے گا کہ نثری نظم غزل نالوں چنگی تخلیق اے۔ بہر حال نہ تے ساری عروضی شاعری چنگی اے تے نہ ای غیر عروضی۔ چنگے تے مندے نمونے دوہیں تھائیں موجود نیں۔

وعدے اُنج کرنے اسان بڑے ہوندے نیں
اوکھے پر بیلیا نبھان بڑے ہوندے نیں
اپنیاں گھراں ول جھاتی کوئی نہیں پاوندا
ہوراں ول لوکاں دے دھیان بڑے ہوندے نیں
چپ چپ رہنے تے حیاتی موت جاپدی
بولیے تے ایتھے نقصان بڑے ہوندے نیں
اوکھے ویلے ویکھیا اے نال کوئی نہیں چلدا
متاں دین والے پردھان بڑے ہوندے نیں
ہتھ وی ملان ویلے بیلیا دھیان رکھیں
سپاں توں وی زہری انسان بڑے ہوندے نیں
ہویا کیہ جے بھل کے میں مندا بول بیٹھا واں
بھجاں نوں بھجاں تے مان بڑے ہوندے نیں
بندیاں توں ہر بندے اُتے وس جاویں ناجیہ
بندیاں دے رُوپ وچ شیطان بڑے ہوندے نیں
بھکھیاں دی بھکھ بھلا کدے کسے ونڈی اے
ایویں پئے حکومتی اعلان بڑے ہوندے نیں
سچیاں پیاراں والا سودا نہیں جے لبھدا
اُنج تے بازاراں وچ دُکان بڑے ہوندے نیں
پھس جاوے بندہ جدوں نس بھج جاوندے
گلیں باتیں جیہڑے قربان بڑے ہوندے نیں
چپ کر ساجدؔا کیہ بیج چھیڑی بیٹھا ایں
بیج وچ ہنیریاں طوفان بڑے ہوندے نیں

حافظ افتخار ساجدؔ/ دیپال پور

پنجابی شاعری

فن فنکار نے کھیلن لئی اک بت بنایا
مٹی چوں تت ویلن لئی اک بت بنایا
میں تے خورے پچ وی جاندا ہوسکدا اے
یار دے دکھ وی جھیلن لئی اک بت بنایا
دریا پار تے کچے گھڑے دا جوت ربانی
خونی چھل اچ ٹھیلن لئی اک بت بنایا
اُت خدا وی بندہ وی کوئی بندہ بن دا
گلیں باتیں ٹالن لئی اک بت بنایا
ماس تے ہڈیاں ویسے وی کجھ سخت بنایاں
جذب دی اگ اچ گالن لئی اک بت بنایا
رازق سی اوہ رزق تے سب نوں دیناسی نا
قبر دے کیڑے پالن لئی اک بت بنایا
سونا چاندی موتی ایہدے اندر ہوسن
کشتہ ایہدا مارن لئی اک بت بنایا
ایہہ تے پہلے طے سی جو کجھ ہونا ہندا
لیکھاں راہیں ہارن لئی اک بت بنایا
مٹی دے وچ جذبے وی سن آپے پائے
کندھاں وچ اسارن لئی اک بت بنایا
ہور تے کوئی اپنے جوگا ملیا نہیں سی
پل صراط توں لنگھن لئی اک بت بنایا
عشق دی پینگ وکھانی بہت ضروری ہوسی
سر نیزے تے ٹنگن لئی اک بت بنایا
کجھ ضرورتاں اوہنے اپنے ہتھ اچ رکھیاں
ترلے پا کے منگن لئی اک بت بنایا
کنے نوری عرش تے شاناں والے ہوتے
مٹی دے وچ رولن لئی اک بت بنایا
اوہ تے اوہنوں ویکھن تک محدود رہے سن
اکھوں راہاں ڈولن لئی اک بت بنایا
ہجر وصال وچھوڑے دی تخلیق نویں سی
ایہناں دی کجھ گھولن لئی اک بت بنایا
خورے اج تے گلاں کسراں کردے ہوسن
موہنہ دے ریش چوں بولن لئی اک بت بنایا
یار بے چھڈ کے ٹر جاوے تے ننگے پیریں
تھل مارو اچ ٹولن لئی اک بت بنایا
کج رفیق نوں سیتا فن دے پیراں اُتے
رت قرطاس تے ڈولن لئی اک بت بنایا

رفیق کاشمیری/اوکاڑا

اج سی چیک پکاراں سجیاں
گھر دے وچ دیواراں سجیاں
جنہاں سر تے کدے نہیں جھی
اونہاں سر دستاراں سجیاں
اکھاں میچ کے لکھ جاؤ سارے
عزتاں لکھ ہزاراں سجیاں
روئی دی بکھھ کھلے کیتا
گڈیاں وچ قطاراں سجیاں
شاناں والے بے توقیرے
ویلے ہتھ مہاراں سجیاں
کنج دا ویلا آیا اے ہن
اکھاں گلی بازاراں سجیاں
شالا اکھاں کدی تاں ویکھن
باگاں وچ بہاراں سجیاں
شاہد سارے اکھر کہندے
غزلاں نال پیاراں سجیاں

ازعبدالرشید شاہد/ننکانہ صاحب

سجدے مری جبین دے پتھراں چ رہ گئے
نغمے کسے دی پیت دے ہاواں وچ رہ گئے
ہجو تراش دے رہے مورت فراق دی
وعدے ترے وصال دے سدھراں چ رہ گئے
لٹیا قرار تیریاں نظراں نے جبین دا
دل تے جگر وی زلف دے کنڈلاں چ رہ گئے
آساں دا زہر پی گیا سقراط، سوچ دا
لاشے وفا دے سہکدے قبراں چ رہ گئے
اُلفت نوں رول رول کے بھیڑی اَنا دے بت
کعبے چوں کوچ کر گئے جسماں چ رہ گئے
تارے مرے نصیب دے چمکے نہ دوستو
چن دا مزاج ویکھ کے بدلاں چ رہ گئے
تاں رنجگے سدا لئی عاکف بنے رفیق
یاداں دے روڑ میریاں اکھاں چ رہ گئے

عاکف/اوکاڑا

ویکھ کے تیری اک مسکان
سدھراں دل وچ جھلی پان
تیری خوشبو آندی اے
مہکاں جد وی پھلں اڑان
نیلی اکھ دے جادو نال
پتھراں دے وچ چھیندی جان
اوہ تے سچ دے قاتل ہون
جیہڑے بوہتیاں قسماں کھان
مکاراں دے میلے وچ
شاہد اج وی اے نادان

شاہد عباسی/لاہور

پنجابی شاعری

بلھاں اُتے ہاسے چنگے نہیں لگدے
جھوٹے دم دلاسے چنگے نہیں لگدے
اوکڑ ویلے اپنے جگری یارا!
وٹ لیون جے پاسے چنگے نہیں لگدے
عشق دی رتی وی چنگی لگدی اے
عقلاں دے تولے ماسے چنگے نہیں لگدے
پھلاں ورگے ہتھاں دے وچ
چھراں دے کاسے چنگے نہیں لگدے
دکھ، درد تے غم دی جاگیراں نیں
اوہے ایہہ اثاثے چنگے نہیں لگدے

ظفر جبار/کراچی

سانجھیاں سوچاں، سانجھے دکھ سکھ، سانجھے ساڈے خواب
وکھو وکھ سوال لوکاں دے، پر ساڈا اک جواب
سانجھی منزل، سانجھے پینڈے، سانجھیاں ساڈیاں راہواں
بت نے بے شک وکھرے سارے پر اک نے ساڈیاں ساہواں
سانجھیاں پیڑاں، سانجھے دکھڑے، سانجھے پنڈ گراں
گھر تے وکھو وکھ اساڈے، پر سانجھی دھرتی ماں
سانجھیاں خوشیاں، سانجھیاں کھیڈاں، سانجھی سانوں سک
وکھرا خون ہر بندے دا، پر خون دا رنگ اے اک
سانجھیاں رسماں، سانجھی بولی، سانجھا اُٹھنا بہنا
جینا مرنا سانجھا ساڈا، سانجھ اساڈا گہنا

محمد علی اسد بھٹی بڈالی

کجھ کرنا اے تے کر جاواں ویلے نال
ایہہ نہ ہووے کہ مر جاواں ویلے نال
فیر اج اوہنے ملن دا وعدہ کیتا اے
خبرے جھوٹھ اے پر جاواں ویلے نال

جیون تے بس ناں اے کھسن گھیراں دا
ہر کوئی چاہندا اے تر جاواں ویلے نال
لڑدا رہنا اے میں نال مقدر دے
کاہدا مرد آں جے ہر جاواں ویلے نال
میں پیار دی حد ویکھنی چاہناواں
اوہ تے چاہندا اے ڈر جاواں ویلے نال
کھا نہ جاون واجاں ایس بازار دیاں
سورج ڈبے تے گھر جاواں ویلے نال
در در دی ڈر ڈر دے نالوں شافی جی
کیوں نہ دردی دے در جاواں ویلے نال

عقیل شافی/لاہور

غرضاں ماری، ساری دُنیا
تاں دھتکاری، ساری دُنیا
اُتوں اُتوں کنی مٹھی
اندروں کھاری، ساری دُنیا
من مرضی دا ناچ نچاوے
ہتھ مداری، ساری دُنیا
جیوندے نوں پئی اگاں لاندی
ایہہ ست کاری، ساری دُنیا
من دے اندر کلا ہویاں
سا کے داری، ساری دُنیا
دل دی دُنیا اپنی وڈی
بوہا باری، ساری دُنیا
تیرا صدقہ فیر نہ اُترے
تیتھوں واری ساری دُنیا
تیرے کولوں ہار گیا میں
میتھوں ہاری ساری دُنیا
لالچ دے وی بولی ہوئی
ہتھیں ماری، ساری دُنیا
دو ویلے دی روٹی دے دے
پھڑ وپاری ساری دُنیا
یار انیس احمد کیہ آکھاں
ہے مت ماری ساری دُنیا

انیس احمد

اکھر جد وی کھارے نکلے
ہنجو نین چوں ہارے نکلے
نین اشارے میتھوں وارے
سب دے سب ای لارے نکلے
وچ اُڈیک دے بھل گئے نیندر
پل وی بن کے تارے نکلے
ہجر فراق دے دشتاں اندر
ہوکے، ہاواں سارے نکلے
رل مل ہسے ہاسے جیہڑے
جنڑی توں وی بھارے نکلے

محمد اجمل خان/بہاول نگر

راتیں چمکن تارے ویکھے
دن نوں شوخ نظارے ویکھے
باغاں دے وچ کھلدے جیہڑے
مُل وکدے بازارے ویکھے
جگ تے چنگے کجھ مندے وی
ایتھے لوک میں سارے ویکھے
عشق سمندر ڈبدے تردے
گبھرو جندے، ہارے ویکھے
ڈبدی کشتی ویکھی ساگر
ویکھے کول کنارے ویکھے

صدام ساگر/گوجرانوالہ

اج کل کجھ طوفان دے وچ آں
ساہواں دے زندان دے وچ آں
اپنے جی نال آڈھا لا کے
برہا دی سنتان دے وچ آں
جیہڑا مینوں لبھے اوسے
دل کملے نادان دے وچ آں
دھرتی اُتے پیر نیں میرے
ایسے لئی اسمان دے وچ آں
ہاسے دی بکل وچ بیٹھی
روح دے قبرستان دے وچ آں
مینوں میتھوں لبھنا اوکھا
بھاویں میں خاقان دے وچ آں

خاقان حیدر غازی/لاہور

اوہ کیہ ہونا ایں

جیون لگے بال دے ہتھ وچ
کجھ دا اک کھڈونا ایں
اینی گل ای سوچ کے دسو
ہن ہسنا یا رونا ایں
جیہوں اج تک
کئی شکلاں وچ لبھیا اے
اوہدا سوچو! آخر
اوہ کیہ ہونا ایں

خاقان حیدر غازی/لاہور

ہر اک ساہ تے جیون اتھر ہویا اے
اپنا گھر ای قید برابر ہویا اے
کے پرانی واج وکھالا دیتا نہیں
جیون کس کرلاٹ تے پتھر ہویا اے
کیہ گھر وچ ماں ہسے یا رووے گی
ست دھیاں دے بعدوں پتر ہویا اے
پیراں ہیٹھوں دھرتی گھٹ دی جاندی اے
سر دے نیڑے کنا امبر ہویا اے
میری اکھ نال ساڈی رت نوں ویکھیں نہ
میرے اندر سبھ کجھ کھنڈر ہویا اے
غازی اندر جھات وکھالا دیوے نہ
ستا ایس دے وچ مندر ہویا اے

خاقان حیدر غازی/لاہور

دیس ماہی دا دُور اے

دیس ماہی دا دُور اے
شہ رگ توں وی نیڑے وسدا
مینوں جاپے دور اے
دیس ماہی دا دور اے
اکھیاں تائیں نظر نہ آوے
ہیگا رب دا نور اے
دیس ماہی دا دور اے
حسن دیاں نیں دُھماں پیاں
عاشق ہوئی حور اے
دیس ماہی دا دور اے
شاماں پیاں شام نہ آئے
ولڑی ہوں مجبور اے
دیس ماہی دا دور اے
جاندے نوں نہ موڑ لیاندا
ہویا بہت قصور اے
دیس ماہی دا دور اے
چماں قدم نذیر میں مڑ مڑ
آون جے آپ حضور اے
دیس ماہی دا دور اے

حاجی نذیر احمد نذیر/منڈی فیض آباد

پیا گلی اساڈی لنگھ وے

میرے نال نے نت اجوڑاں
غیراں نال نے سنگ وے
پیا گلی اساڈی لنگھ وے
ناگن زلفاں تیریاں ماہی
مارن مینوں ڈنگ وے
پیا گلی اساڈی لنگھ وے
میں اُجڑی تے گل نہیں کوئی
شالا لگی رنگ وے
پیا گلی اساڈی لنگھ وے
ہوراں وں نہ پردہ کوئی
میتھوں جاویں سنگ وے
پیا گلی اساڈی لنگھ وے
تخت ہزارے دے وسنیکا
آ جا ساڈے جھنگ وے
پیا گلی اساڈی لنگھ وے
تاریاں وانگوں نیندر کتھوں
رات وی کردی تنگ وے
پیا گلی اساڈی لنگھ وے
درد نذیر جے ساڈا کھاویں
خیر غریب دی منگ وے
پیا گلی اساڈی لنگھ وے

حاجی نذیر احمد نذیر/منڈی فیض آباد

کویت میں مقیم جدید لب و لہجے کے نمائندہ شاعر

خالد سجاد

کا پہلا شعری مجموعہ جلد شائع ہو رہا ہے

یونہی گرے نہیں برگِ شجر دسمبر میں
بچھڑ گیا تھا کوئی ہم سفر دسمبر میں
تو کیوں بہار کے موسم میں حال پوچھتا ہے
دکھائی دیتا ہے غم کا اثر دسمبر میں
شجر کے ٹوٹتے پتوں پہ دل ملول نہ کر
پرندے جھاڑتے ہیں بال و پر دسمبر میں
گلاب کھلنے کے موسم میں پھر ملیں گے ہم
بچھڑ گئے ہیں جو اب کے اگر دسمبر میں
نجانے کون مجھے یاد آ گیا خالدؔ
برس رہی ہے مری چشم تر دسمبر میں

نستعلیق Publications
غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

عمان (مسقط) میں مقیم خوبصورت شاعر

ناصر معروف

کے شعری مجموعے "تیری آرزو رہی" کا دوسرا ایڈیشن
جلد شائع ہو رہا ہے

مرے قافلے کے جو لوگ تھے انہیں رنج مال و منال تھا
فقط ایک میں ہی بچا رہا جسے صرف تیرا خیال تھا
ترے انتظار کے شہر میں، مرے ماہ و سال گزر گئے
مگر اپنی فکر نمود میں تجھے کب کسی کا خیال تھا
سر کوئے شوق گزر گئی اسی کیفیت میں یہ زندگی
نہ زباں پہ تھا کوئی مدعا نہ نظر میں کوئی سوال تھا
سر بزم اور بھی لوگ تھے تری اک نگاہ کے منتظر
یہ بتا وفا کے نصاب میں کوئی شخص میری مثال تھا
کبھی لب پہ شعلۂ حرف تھا کبھی دل کا شعلہ بھی برف تھا
ترا قرب اپنی جگہ مگر یہ فراق تھا کہ وصال تھا؟

نستعلیق Publications
غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

ارژنگ
2015

ممتاز شاعرہ اور کالم نویس

ڈاکٹر صغریٰ صدف

کے شعری مجموعے

وعدہ

کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

نستعلیق
Publications
غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

گوجرانوالہ میں مقیم ممتاز سفرنامہ نگار، کالم نویس

مزاح نگار اور شاعر

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار

کا پہلا شعری مجموعہ

بھیگی شام اور جلتے چراغ

شائع ہو گیا ہے

اس کے علاوہ ان کی تمام کتب کے نئے ایڈیشن
اشاعت کے مراحل میں ہیں

نستعلیق
Publications
غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

طنز و مزاح کے انداز سے میں لکھنا کس کے اختیار میں ہے آسان کام نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیگر اصناف ادب کے برعکس بہت کم لوگوں نے اس صنف کے ساتھ طبع آزمائی کی کوشش کی۔ جو یہ ان میں آئے ان میں سے بھی بیشتر اس صنف کو نبھا نہ سکے اور ان کی "ادبی" بکلانے میں بھی کامیاب نہیں ہوئے اور اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔ طنز و مزاح کے میدان میں شاعروں کی طرح الٹھوں کا مجمع نہیں ہے۔ بلکہ جو بھی دیوانہ آتا ہے جلد پہچانا جاتا ہے اور آئے دیکھ کر خوشی بھی ہوتی ہے کہ آخر اس خار زار میں کسی نے تو قدم رکھا۔ حافظ مظفر محسن بھی ہمارے قبیلے کا ایک فرد لگتے ہیں۔ وہ ایک جینوئن مزاح نگار ہیں۔ ملاقات سے پہلے اخبارات کی ورق گردانی کرتے ہوئے کبھی کبھار مظفر محسن کی کوئی تحریر نظر سے گزر جاتی۔ وہ تحریر یقیناً طنز و مزاح کے زمرے میں آتی اور دیگر تحریروں کے زمرے میں بالکل ان دونوں کے مابین کوئی دلچسپ سی کوئی تحریر ہوتی۔ مظفر محسن سے جب دو چار ملاقاتیں ہوئیں تو اندازہ ہوا کہ وہ صرف شگفتہ نثر ہی نہیں لکھتا بلکہ خوبصورت جملوں کے تیر رہا شرارتیں اور چٹکلے نمایاں بھی کرتا ہے۔ حافظ مظفر محسن کی تحریر میں اس کی شخصیت کے سب پہلو جھلکتے ہیں۔ لہٰذا اس کی تحریر پڑھ کر اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ روز مرہ کے واقعات کو موضوع بناتا اور ہمارے اردگرد پھیلے کرداروں کو تحریر میں ڈھالتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان سے مختصر کہانیاں اور داستان کہہ کر ان سب کو باعزت بری بھی کر دیتا ہے۔ حافظ مظفر محسن کو مزاح لکھنے کا حق اس لیے بھی حاصل ہے کہ اس کے چہرے پر ایک کھلی مسکراہٹ ہر وقت کھیلتی رہتی ہے جو کہ آج کی زمانہ کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہمیں لگے کی بہت ہے کہ وہ ایک پیارا شخص، انسان ہی نہیں بلکہ ایک شگفتہ اور جینوئن مزاح نگار بھی ہے۔

عطاء الحق قاسمی

ممتاز ادیب اور مزاح نگار

حافظ مظفر محسن

کی طنز و مزاح پر مشتمل کتاب

"ہونا نہیں بے وقوف"

کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

اپنی کتاب کی بہترین اشاعت کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

نامور ناول نگار شاعر اور بچوں کی کہانیوں کے مصنف

احمد عدنان طارق

کی بچوں کی کہانیوں پر مشتمل پہلی کتاب "تزئین و تتلیاں"
کی زبردست پذیرائی کے بعد دوسری کتاب

بارش اور گلاب

شائع ہو گئی ہے

بچوں کے لیے لکھنا آسان ہے یا مشکل؟ اس بارے میں دونوں باتیں کی جا سکتی ہیں۔ بچوں کے لیے لکھنے والے کو بچہ بننا پڑتا ہے۔ اور یہ بات ان کے لیے یقیناً اطمینان کا باعث ہوگی کہ اپنی قوم کے بچوں کے لیے بچے بن گئے ہیں۔ اسی میں ان کی عظمت ہے، بڑائی ہے، کامیابی ہے۔ اس کتاب کو ہم اس نظر سے دیکھیں گے تو یہ ہمیں بلند مقصد میں پنہاں ایک دستاویز نظر آئے گی۔ یہ باتیں میں نے اپنے محسوسات کی حد تک لکھ دی ہیں تاکہ سند رہیں اور بوقت ضرورت کام آ سکیں۔

اشتیاق احمد

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

ناشر: حسن عباسی

کینیڈا میں مقیم معروف شاعرہ

تن دیپ تمنا

کا پہلا شعری مجموعہ

پہلا گیت محبت کا

مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہوگیا ہے

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

(امریکہ (نیویارک) میں مقیم معروف شاعرہ اور افسانہ نویس

انیلہ جُلّر

کے افسانوں کی پہلی کتاب

نہیں.....

نہایت دیدہ زیب گیٹ اپ میں شائع ہوگئی ہے

اپنی کتاب کی بہترین اشاعت کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

عطاء الحق قاسمی

مجھے معلوم جو ہوتا تو میں منصف نہیں بنتا
زمیں کیا بانٹ دی میں نے وہ پیارے بانٹ آیا ہوں

کویت میں مقیم خواتین شاعرات میں اولین شعری مجموعے کی خالق

مسرت جبیں زیبا

کا تازہ پنجابی شعری مجموعہ

ٹاہلیاں تھلے

شائع ہوگیا ہے

کویت میں مقیم معروف شاعر

بدر سیماب

کا اولین شعری مجموعہ

"تمہیں سوچا تمہیں چاہا"

شائع ہوگیا ہے

ناشر: مثال پبلشرز فیصل آباد

کلاسک ادب آپ کو معیارات اور عصری ادب آپ کو چیلنج دیتا ہے۔

عصری ادب پر نظر رکھے بغیر آپ کی تخلیقی جدوجہد ارتقا کا ساتھ دینے کی طاقت سے محروم ہو جاتی ہے۔

ممتاز شاعر اور سفرنامہ نگار ڈاکٹر جعفر حسن مبارک سے حسن عباسی کی گفتگو

● آپ کی پیدائش کب کہاں اور کس خاندان میں ہوئی؟

● میری نمودِ خاکِ شہرِ ہنروراں سے ہوئی ہے جسے اُس زمانے میں لائل پور کہا جاتا تھا۔ پنجاب کی دریائے چناب اور دریائے راوی کے مابین واقع، ساندل بار میں بسائے اس شہر کو اب فیصل آباد کے نام سے جانا جاتا ہے اگرچہ لائل پور کو فیصل آباد بنے کئی دہائیاں گزر چکی ہیں مگر اب بھی اس شہر کے بہت سے دیگر باسیوں کی طرح۔۔۔کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے اِس شہر جہاں کی خاک سے میرا خمیر اُٹھا ہے، کے نام کی اِس تبدیلی نے مجھے اُسی ثقافتی، تہذیبی اور تاریخی ورثے سے بیک جنبشِ قلم محروم کر دیا ہے جو علامتی طور پر ''لائل پور'' نام کی شناخت میں سموئی ہوئی تھی، جہاں تک تاریخِ پیدائش کا معاملہ ہے تو ٦ جون میری سالگرہ کا دن ہے جسے اکثر مناتا بھول جاتا ہوں، جہاں تک شجرۂ نسب کا سوال ہے تو میرا شجرۂ نسب خاندانِ بنو ہاشم سے ہوتا ہوا دیگر تمام انسانوں کی طرح حضرت آدمؑ تک جا نکلتا ہے۔۔۔گویا خاندانی حوالہ سے آپ یوں کہہ لیں کہ اپنے آپ کو کسی تخصیص یا امتیاز سے تہی خیال کرنا میرا پسندیدہ طرزِ عمل ہے۔ میری فردیت اگر کوئی امتیاز یا پہچان چاہتی ہے تو صرف کردار کی بنیاد پر۔۔۔میرا ایمان ہے کہ امتیازات کی بنیاد ''تقویٰ'' کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔

● اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں؟

● میں نے ایک ایسے متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں علم و ادب کو ایک نمایاں تہذیبی قدر کا درجہ حاصل تھا۔ لہٰذا فطری طور پر بچپن ہی سے کتاب آشنائی کے مواقع میسر ہوئے۔۔۔علمی و ادبی سرگرمیوں پر حوصلہ افزائی کا ماحول مِلا۔۔۔سکول لائف نے زیادہ تر کتب بینی اور ''بزمِ ادب'' کے معمولات تک محدود رکھا جب کہ کالج لائف نے اس قابل بنا دیا کہ تنظیمی حوالہ سے مختلف ادبی انجمنوں کا قیامِ عمل میں لائے

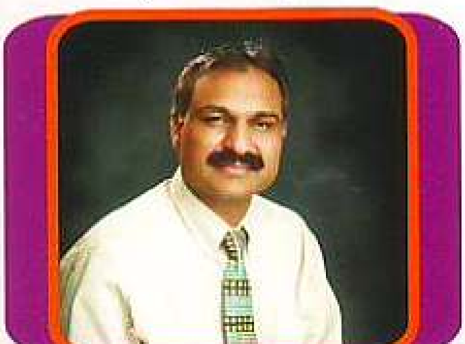

ہوئے مباحثوں، مذاکروں، مشاعروں کے اہتمام میں کوئی کلیدی کردار سرانجام دے سکوں۔۔۔اپنی عمر کے اُس حصے پر نظر ڈالتا ہوں تو کل پاکستان سطح تک طلبا و طالبات کے مابین بے شمار مباحثوں اور مذاکروں کا اہتمام اپنے کریڈٹ پر پاتا ہوں۔ آج کے بہت سے مقبول تخلیق کار ایسے ہیں جن سے اُس زمانے سے یاد اللہ قائم و دائم چلی آ رہی ہے جب انھیں نئے لکھنے والوں کی فہرست میں شامل کیا جاتا تھا۔۔۔جب کبھی ان سے صاحب سلامت کا موقع ملتا ہے۔ اُس زمانے کے مشاعروں اور مباحثوں کی بات بھی چل نکلتی ہے۔۔۔تو وہ اعتراف پر بخل سے کام نہیں لیتے کہ ان مباحثوں، مشاعروں، مذاکروں اور مضمون نویسی کے مقابلوں نے ان کی ادبی اور تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔۔۔میں اپنے اِس زمانے کے ادبی کردار پر نظر ڈالتا ہوں تو سچی بات ہے کہ آپ کو تخلیق کار کم اور ادبی تنظیموں کے منتظم کے طور پر زیادہ بااعتبار پاتا ہوں، حالانکہ میں اپنے کالج کے ادبی میگزین کا مُدیر تھا۔ کالج کے زمانے سے کُل پاکستان بین الکلیاتی مقابلوں میں اپنے تعلیمی اِداروں کی نمائندگی کی اور بہت سارے انعامات کالج کی زینت کیے۔

● ادب کی طرف کب اور کیسے مائل ہوئے؟

● میرا ادبی میلان قطعاً کوئی حادثاتی معاملہ نہیں ہے کہ کسی خاص واقعے نے اچانک مجھے متاثر کرتے ہوئے اس راہ پر ڈال دیا ہو۔۔۔میں اگر اس حوالہ سے اپنا تجزیہ کروں تو مجھے لگتا ہے کہ یہ میلان مجھے فطرت ہی کا عطا کردہ ہے۔ اتفاق سے مجھے ماحول بھی ایسا میسر آیا کہ اِس میلان کو میرے ساتھ ساتھ پروان چڑھنے میں کوئی دِقت پیش نہیں آئی۔۔۔تاہم کالج کے زمانے تک لکھنے لکھانے کا سلسلہ اپنی تخلیقات حلقۂ دوستاں سے شیئر کرنے تک محدود رہا۔۔۔

قاری کا مطالعہ اُسے جو بھی نتائج دے، ان کے اظہار سے مباحث کو اپنا جواز پانے کا موقع ملتا ہے

بقیہ اندرونی صفحات

جاپان میں اردو سائن بورڈ

عامر بن علی

بظاہر تو اردو زبان اور جاپان میں کوئی تال میل، جوڑ نظر نہیں آتا۔ حقیقت مگر ذرا مختلف ہے۔ جاپانی سرزمین اردو زبان کے لیے نہ تو اجنبی ہے اور نہ ہی یہ نئی ہے۔ تحقیق کے مطابق یہاں اردو کی تاریخ سن 1796ء میں اردو زبان کی ایک لغت کی تیاری سے شروع ہوتی ہے۔ اس وقت جاپان کے تین بڑے شہروں، ٹوکیو، اوساکا اور سائی تاما کی جامعات میں شعبہ اردو موجود ہیں جن میں بہت سارے مقامی طلباء و طالبات اُردو زبان سیکھنے میں سرگرداں ہیں۔ ٹوکیو یونیورسٹی، دائتوبنکا یونیورسٹی اور اوساکا انٹرنیشنل یونیورسٹی میں شعبہ اُردو کے سربراہان اور سٹاف کی غالب اکثریت جاپانی النسل ہیں۔ مگر سب فرفر، روانی سے اردو بولتے ہیں۔ تقریباً تمام اساتذہ کرام پاکستان کے تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل ہیں۔ کچھ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے تو کچھ جامعہ کراچی سے پڑھے ہیں۔ اُردو زبان سے متعلق ایک منظر مگر یہاں ان جاپانی درس گاہوں سے باہر کا ہے۔ میرے ساتھ یہاں بار ہا ایسا ہوتا ہے کہ اردو میں تحریر کردہ کوئی سائن بورڈ دیکھتا ہوں اور ٹھٹک جاتا ہوں۔ موضوع ایسا ہے کہ پڑھنے سے زیادہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک تصویر تحریر کیے ہوئے پانچ سو الفاظ کے برابر ہوتی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ ماہنامہ ارژنگ کے قارئین کو یہ تصاویر پسند آئیں گی۔ ویسے بھی ''ارژنگ'' کا تو مطلب ہی تصویری البم ہے۔

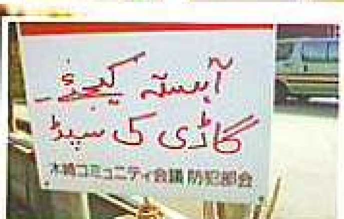

Design By: MUHAMMAD AHSUN